تحقیق

وحدت الوجود والشہود

مع

حالات مصنف

مولانا شیخ محمد تھانوی محدثؒ

مرتبہ:

ثناء الحق ایم۔اے (علیگ)

297.431
M37

ناشر:

پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱ وحید آباد) گولیمار کراچی ۱۸

تحقیق

وحدت الوجود والشہود

مع

حالات مصنف مولانا شیخ محمد تھانوی محدث

مرتبہ

ثناء الحق ایم۔ اے (علیگ)

ناشر

پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱ وحید آباد) گولیمار کراچی ۱۸

سال طباعت ۱۹۶۳ء

بار اول ایک ہزار

مطبوعہ : —— ایجوکیشنل پریس کراچی

فہرست مضامین

ا۔ مقدمہ ۵ تا ۱۵

ب حالات مصنف ۱۶ تا ۱۲۲

۱۔ وطن اور خاندان ۱۶

۲۔ پیدائش تربیت اور والدین کے سایہ سے محرومی ۱۷

۳۔ ابتدائی تعلیم ۱۸

۴۔ دہلی کی حالت اور شاہ ولی اللہؒ کا اثر ۱۹

۵۔ تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر ۲۱

۶۔ بالاکوٹ کا واقعہ اور حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کا ہجرت فرمانا ۲۲

۷۔ دہلی سے واپسی کے بعد علمی سرگرمیاں۔ ۲۳

۸۔ شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار ۲۵

۹۔ حضرت میانجیو نور محمدؒ سے بیعت ۲۷

۱۰۔ بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات۔ ۳۰

۱۱۔ حضرت میانجیو کی نگاہ میں حضرت مولانا کا مرتبہ ۳۱

۱۲۔ حضرت میانجیو کا روحانی فیض اور وصال۔ ۳۵

۱۳۔ سفر حرمین الشریفین اور شاہ محمد اسحٰقؒ سے اخذ فیض۔ ۳۶

۱۴۔ حج سے واپسی کے بعد۔ ۳۸

۱۵۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے مناظرہ۔ ۴۰

۱۶ جنگ آزادی کے شروع میں تھانہ بھون کی حالت ۴۵
۱۷ تھانہ بھون کے جہاد کے اسباب، واقعات اور نتائج ۔ ۴۷
۱۸ روپوشی کا زمانہ ۔ ۶۴
۱۹ ٹونک میں قیام ۔ ۶۵
۲۰ ٹونک سے واپسی ۔ ۶۷
۲۱ آخری ایام، مرض الوفات اور وصال ۔ ۶۹
۲۲ انتقال کے وقت ایک عجیب واقعہ ۔ ۷۶
۲۳ آپ کے مزار کی حالت ۔ ۷۷
۲۴ علم و فضل اور شمائل و خصائل ۔ ۷۷
۲۵ ازواج و اولاد ۸۴
۲۶ تلامذہ ۔ ۸۷
۲۷ مریدین و خلفاء ۸۷
۲۸ تصنیفات ۸۹
ج ۔ رسالہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود ۱۲۳ تا ۱۵۹
د ۔ کتابیات ۔ ۱۶۰

مقدمہ

حضرت مولانا شیخ محمدؒ تھانوی جن کا ایک مختصر رسالہ مع حالات زندگی مصنف علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں میرے پر نانا تھے۔ بچپن سے حضرت موصوف کا ذکر اپنی والدہ سے سنا کرتا تھا۔ پھر کہیں کہیں کتابوں میں بھی یہ نام نظر سے گذرنے لگا۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس اجل ہستی کے جو جامع شریعت و طریقت تھی تفصیلی حالات کہیں ملیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ تذکرہ نگاروں کی کوتاہ قلمی کے سبب بہت کم حالات یکجا ہوئے ہیں تلاش و جستجو کے دوران تھوڑا سا ذکر رسالہ عطار المنان میں ملا اس نے آتش شوق کو اور بھڑکا دیا۔ ۱۹۵۷ء میں دیوبند جانے کا اتفاق ہوا۔ دار العلوم کے کتب خانہ میں حضرت کی چند تصنیفات ارشاد محمدی، انوار محمدی اور مثنوی معنوی دفتر ہفتم نظر سے گذریں۔ کم فرصتی کی وجہ سے ان کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقعہ تو نہیں مل سکا۔ البتہ ان کے اقتباسات جن سے حضرت کے حالات اور اُن کتابوں کے مضمون

پہ روشنی پڑتی تھی لے لئے۔ اسی سفر سے واپسی کے وقت والد مرحوم مولوی عطاء الحق صاحب کے پاس سے حضرت مولانا کی قلمی بیاض بھی ساتھ لیتا آیا اور اس کا خوردبینی جائزہ لیا۔ بحمد اللہ اس سے مجھے بہت سے حالات معلوم ہوئے اسی بیاض میں آپ کا ایک فارسی رسالہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی دقیق بحث پہ نظر آیا۔ یہ اگرچہ مطبع نیمروز بجنور میں کبھی طبع ہو چکا ہے لیکن اب نایاب ہے اس لئے خواہش ہوئی کہ اسے دوبارہ طبع و شائع کیا جائے۔

میرے عزیز دوست جناب محمد ایوب قادری اس امر کے محرک ہوئے کہ میں پہلے حضرت مولانا کے مختصر حالات جو مجھے اس وقت تک دستیاب ہوئے تھے یکجا کر کے کسی رسالہ میں شائع کرا دوں بعدہٗ جب تفصیلی حالات مل جائیں تو ان کو رسالہ مذکور کے ساتھ شامل کر کے کتابی شکل میں شائع کرا دوں۔ رائے کے صائب ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن میں اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتے ہوئے ان دونوں حکموں کی تعمیل سے ہچکچاتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے محترم دوست ان دونوں کاموں کو مجھ سے کہیں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے تھے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ وہی ان حالات کو ترتیب دیں لیکن انہوں نے مجھے بتایا کہ "حضرت مولانا تمہارے بزرگ تھے اس لئے تم پہ ہی اپنے ان بزرگ محترم کے حالات زندگی لکھنے کا فریضہ عاید ہوتا ہے"۔

بات معقول اور دلیل قوی تھی۔ فوراً سمجھ میں آ گئی اور میں ان

دونوں ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ وقتاً فوقتاً جو کتابیں ملتی رہیں ان سے مواد جمع کرکے ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں ترتیب دیا اور العلم کے شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع کرادیا۔

یہ مضمون لکھنے کے بعد پھر میرا کوتاہ خامہ رک کر رہ گیا۔ لیکن میرے دوست قادری صاحب مجھے کب بخشنے والے تھے انہوں نے اپنے اصرار کو جاری رکھا اور مجھے اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار کرلیا۔ انھوں نے مجھے اس راہ پرُ خار میں بھٹکنے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ دیا بلکہ وہ اول سے آخر تک میری رہبری کرتے رہے جہاں سے بھی ممکن ہوا مواد فراہم کرکے مجھے دیا اور اس طرح میرے راستہ کو دقتوں اور دشواریوں سے صاف کیا۔

جس طرح تحریری مواد کا سب سے بڑا ذریعہ قادری صاحب بنے اسی طرح زبانی روایتیں تمام تر مجھے اپنے خالو قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھالوی سے جن کا مرتبہ اردو فارسی نظم و نثر میں نہایت بلند ہے اور جو تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں حاصل ہوئیں۔ یہ روایتیں میرے ان محترم بزرگ کو حافظ ضامن شہید کے خلف ارشد حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم سے اور ایک اور بزرگ بخشی محمد حسن صاحب مرحوم سے پہنچی تھیں۔ اس مواد کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حافظ محمد یوسف اور بخشی محمد حسن دونوں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں از اول تا آخر شریک رہے اور تمام واقعات ان

کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔

ان دو بڑے ذرائع کے علاوہ جن کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے بعض اور کتابیں بھی میرے پیش نظر رہیں لیکن یہاں ان سب کے نام ایک ایک کر کے گنانا مشکل ہے[1] تاہم یہ اعتراف میرے لئے ناگزیر ہے کہ اگر ان کتابوں سے مجھے استفادہ کا موقع نہ ملتا تو اس تحریر میں یقیناً خاصی تشنگی رہ جاتی۔

اس تمام مواد میں جس سے مجھے مدد ملی دو حضرات کی بعض عبارتیں تکلیف دہ ہیں ایک صاحب تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کی دوسری مولانا عبید اللہ سندھی کی دونوں نے معمولی سے نظری اختلاف کی وجہ سے حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے کردار کو خاصا مجروح کیا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اپنی گرانقدر تالیف تذکرۃ الرشید میں چند مقامات پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا مناظرہ پیش کیا ہے اس موقع پر اگر وہ غیر جانبداری سے کام لیتے اور اس امر پر غور کرتے کہ مولانا شیخ محمدؒ عمر، علم اور تقویٰ ہر لحاظ سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے افضل تھے تو منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا کہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا بچپن اور ان کی کم فہمی تھی کہ وہ جوانی کے جوش میں مولانا شیخ محمدؒ جیسی مقتدر ہستی کے مقابلہ میں میدان مناظرہ میں اترے۔ اس وقت ان کی حیثیت ایک فارغ التحصیل نوجوان سے زیادہ نہیں تھی عمر اور تجربہ کی کمی اور تحمل و ضبط کی عدم پختگی نمایاں تھی راہ طریقت میں بھی اس وقت تک قدم نہیں رکھا تھا۔ ان ہی سب باتوں کا

---

[1] تمام ماخذ کتابیات کے عنوان کے تحت آخر میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

نتیجہ تھا کہ ان کی تحریر کا انداز جس کو مولانا عاشق الٰہی نے اپنے ممدوح کی خوبی بنا کر پیش کیا ہے اتنا سوقیانہ ہو گیا تھا۔ غور فرمائیے کہ ایک علمی مناظرہ میں یہ عامیانہ شعر تحریر فرما دیتا ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کس قدر ناتجربہ کاری کی دلیل ہے ایک ایسے مسئلہ کے لئے جس میں خود مولانا رشید احمدؒ فریق مقابل کی حیثیت رکھتے تھے ان کا یہ فیصلہ کر دینا کہ

"مولانا! اس موقع پر آپ شکست کھا گئے مگر مولانا! شرمانے کی ضرورت نہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے"

ان کی بزرگی اور تقدس و تقویٰ پر دلالت کرتا ہے یا جوان العمری کی غیر ذمہ دارانہ اور غیر دانشمندانہ حرکات کو واضح کرتا ہے۔

دوسری جگہ جہاں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا ذکر آیا ہے وہ مجلس شوریٰ کا موقع ہے جو جنگ سے پہلے قصبہ تھانہ بھون میں منعقد ہوتی تھی۔ اس وقت بھی حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمدؒ کی رائے سے حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو اختلاف تھا اس لئے صاحب تذکرۃ الرشید نے حضرت مولانا کی وزنی دلیلوں کو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا اور کچھ لچر دلائل ان سے منسوب کر کے ان کو ایک ہٹ دھرم اور ناسمجھ ملا کی شکل میں پیش کر دیا۔

تیسرا مقام وہ ہے جہاں حضرت مولانا رشید احمدؒ کے تبحر علمی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بالواسطہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو جاہل بنایا گیا ہے گویا اس

متاع عزیز یعنی علم دین کو بھی ان سے چھیننے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بدولت وہ اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ عصر مابعد میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے مالک سمجھے جاتے رہے۔ تذکرۃ الرشید کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب اور حافظ صاحب جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کرکر ان پر عامل تھے بندہ کے کہنے سے کتنے ہی مسائل کے تارک ہو گئے اور واللہ کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ہمکو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا ہے۔"

اس عبارت کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) مولانا رشید احمد کے بیعت کرنے سے پہلے حضرت حاجی امداد اللہ رح اور حضرت حافظ ضامن رح جو خود مسئلہ مسائل سے ناواقف تھے مولانا شیخ محمد رح سے مسئلے پوچھ پوچھ کر کام چلاتے تھے۔

(۲) مولانا رشید احمد رح کے بیعت کر لینے کے بعد ان دونوں حضرات نے سمجھ لیا کہ اب ایک بڑا عالم ہمیں مل گیا ہے لہذا مولانا شیخ محمد رح کو چھوڑ کر ان سے رجوع کرنے لگے۔

(۳) مولانا رشید احمد رح ان حضرات کو جو مسئلے بتاتے تھے وہ اکثر مولانا شیخ محمد رح کے بتائے ہوئے مسئلوں سے مختلف ہوتے تھے۔

(۴) حاجی صاحب رح اور حافظ صاحب رح چونکہ پہلے ہی مولانا رشید احمد رح

کی علمیت کا لوہا مان چکے تھے اس لئے بغیر یہ تحقیق کئے کہ ان دونوں علماء میں کس کی رائے صحیح اور کس کی رائے غلط ہے مولانا رشید احمدؒ کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑتے تھے اور ساتھ ہی یہ اعتراف کرتے جاتے تھے کہ ابھی تک ہمیں دھوکا دیا جاتا رہا تھا اور ہم غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ اب تم نے آکر ہمیں صحیح راستہ دکھایا۔

ایک طرف حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے علمی مرتبہ کا اندازہ کیجئے انہوں نے علوم حدیث و تفسیر و فقہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے پڑھ کر ان ہی سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ پھر مکہ معظمہ کے دوران قیام میں حضرت مولانا شاہ محمد لیعقوبؒ سے ان تمام علوم کی سند پائی تھی خود ان کے تبحر علمی کی بدولت علماء کی صف میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا اور خاندان ولی اللہی کے اکابر کی طرح ان کے نام کے ساتھ بھی محدث کا لفظ ہر زمانہ میں آتا رہا۔ دوسری جانب مولانا رشید احمدؒ کی ذات، باقاعدہ طریقہ پر علم دین انہوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ لیکن ان کو کبھی وہ درجہ نصیب نہیں ہوا جس پر مولانا شیخ محمدؒ فائز تھے۔ ایسی صورت میں حاجی صاحبؒ اور حافظ صاحبؒ کا اپنے ایک دوست۔ ہم عصر اور پیر بھائی کو جن کے علمی مرتبہ کو بھی وہ اچھی طرح سمجھتے تھے چھوڑ کر ایک کم عمر مرید کے کہنے پر کسی اور ذریعہ سے تحقیق کئے بغیر چلنے لگنا کیسے باور کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اپنی تالیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے صفحہ ۱۲۰ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"دوسری طرف خود شاہ اسحٰق ؒ کے اپنے گروہ میں ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہوگئی۔ مولٰنا نذیر حسین دہلوی اور مولٰنا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔"

اس عبارت کے ذیل میں جو حاشیہ دیا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے

"شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں"

ضمیمہ جات میں جو نوٹ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے متعلق دیا گیا ہے اس میں حکیم الامت حضرت مولٰنا اشرف علی تھانویؒ پر بھی رکیک حملہ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو یہاں نقل کرتے ہوئے قلب کو اذیت ہوتی ہے۔

بہرکیف یہ سب الفاظ ایک خاص رجحان کے تحت لکھے گئے ہیں ورنہ کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ میاں نذیر حسین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے مخالفین میں سے تھے۔ میاں نذیر حسین سے حضرت مولاناؒ کی واقفیت ضرور تھی لیکن ان سے کہیں زیادہ تعلقات حاجی امداد اللہؒ اور حافظ ضامن شہیدؒ سے تھے۔ اگر محض ذاتی واقفیت ہی سے کسی پارٹی سے متعلق ہونا متحقق ہوتا ہے تو پھر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا تعلق حضرت حاجی امداد اللہؒ کی جماعت سے بہت گہرا تھا۔ اس دعویٰ کے ساتھ یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب تھانہ بھون میں مجلس شوریٰ

منعقد ہوئی تو حضرت مولانا کو بھی اس میں شریک کیا گیا۔ اگر حضرت حاجی امداد اللہ جانتے ہوتے کہ حضرت مولانا شیخ محمد رحمیاں نذیر حسین کی جماعت کے رکن ہیں تو وہ انکو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت کیوں محسوس کرتے۔"

دراصل حضرت مولانا شیخ محمد رح کو کسی پارٹی سے متعلق گردانا ایک بڑی غلطی ہے۔ وہ کلیتاً ایک عالم دین اور ایک صوفی صافی بزرگ تھے انہیں سیاسی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لئے وہ ان سے حتی الامکان علیحدہ رہے۔ مجلس شورہ میں ایک فقہی مسئلہ درپیش تھا اس لئے ان کی شرکت کو ناگزیر سمجھا گیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی بھی یہی روش تھی۔ وہ بھی سیاسی معاملے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ عمر بھر اشاعت دین اور رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ایسی صورت میں انہیں شیخ الہند کی جماعت کا مدمقابل ٹھہرانا قطعاً غلط ہے۔

غرض ان دونوں بزرگوں کی تحریروں میں یہ چند باتیں ایسی شامل ہوگئیں جو بے بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ غلط فہمیوں کا پیش خیمہ ہیں اور ان ہی کی وجہ سے حضرت مولانا کی عظیم شخصیت کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی بلکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے یا تو آپ کے ذکر کو قلم انداز کر دیا۔ یا سرسری سا حوالہ دے کر ختم کر دیا اسی لئے یہاں ان باتوں کی نشاندہی کر دینا ضروری ہوا تاکہ آئندہ کے لئے ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔

شکوہ و شکایت کی اس قدرے طویل داستان کے بعد اب میں شکر و سپاس کے دائرہ میں قدم رکھتا ہوں۔

قاضی محمد مکرم صاحب مائلؔ تھانوی سے میرا جو تعلق ہے وہ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ آج تک میں نہ ان کی بزرگانہ شفقتوں کا جو عمر بھر میرے حال پر رہیں کما حقہ اعتراف کر سکا اور نہ اب اس عنایت کا جو انہوں نے حضرت مولانا رح کے حالات کی ترتیب میں مدد دے کر فرمائی پورا پورا شکریہ ادا کرنے کا خود کو اہل سمجھتا ہوں۔ تاہم اگر وہ قبول فرمائیں تو ان کی خدمت میں بطریق نیازمندی نذر عقیدت پیش کرتا ہوں

صدیق مکرم جناب محمد ایوب قادری نے اس کتاب کی ترتیب میں جو حصہ لیا اس کی تفصیلات بتانے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے شکریہ کے لئے مناسب الفاظ کہاں سے فراہم کروں وہ اس کام کی انجام دہی میں شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ حضرت مولانا کا جو فیض روحانی مجھے پہنچے گا اس میں بھی وہ شریک غالب ہی رہیں گے۔

اب میں مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کی خدمت میں اپنے جذبات کے نخل تازہ سے شکر و سپاس کے کچھ پھول اور شگوفے چن کر پیش کرتا ہوں۔ میں حقیقتاً حکیم محمد عمر رحمۃ تھانوی کے مرتبہ "حالات محمدی" کے حصول میں قطعاً ناکام ہو چکا تھا اور حضرت مولانا شیخ محمد رح کے جس قدر حالات فراہم ہو گئے تھے ان ہی کو یکجا کر کے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا

کہ یکایک ماہنامہ "تذکرہ" اپریل ۱۹۶۲ء دیوبند میں مولانا نے موصوف کا تفصیلی مضمون نظر سے گزرا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مضمون کا ماخذ "حالات محمدی" مرتبہ حکیم محمد عمر چرتھاولی ہے۔ چونکہ اس مضمون میں کئی باتیں میرے لئے نئی تھیں اس لئے میں نے بلا تکلف ان کو اپنے یہاں شامل کر لیا۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ میں نے کہیں بھی الفاظ میں تحریف اور تغیر و تبدل کر کے مضمون کو اپنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر جگہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ "یہ کلیاں کسی دوسرے چمن سے حاصل کی گئی ہیں۔"

میں محترم عبد الغفار خاں صاحب کی خدمت میں بھی ہدیہ تشکر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے نظریہ وحدت الوجود اور نظریہ وحدت الشہود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

جناب عبد الحلیم صاحب حشتی جن کی مملوکہ کتاب ترجمہ حزب البحر (قلمی) سے میں نے استفادہ کیا، محترم اعجاز احمد صاحب علوی اور رفیق محترم وحید اللہ صاحب صدیقی بھی جن سے مجھے بعض کتابیں دستیاب ہوئیں میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ میں اس خوشگوار فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ اپنی اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

ثناء الحق

۲ر نومبر ۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حالات مصنف

وطن اور خاندان تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر[1] (یوپی) کا ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ ہے۔ اسی قصبہ نے قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ، صاحب کشاف اصطلاحات الفنون، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جنم دیا اور یہیں اس رسالہ کے مصنف حضرت مولانا شیخ محمد محدثؒ پیدا ہوئے جو جامع شریعت و طریقت تھے۔

حضرت مولاناؒ تھانہ بھون کے ایک ذی وجاہت فاروقی

---

[1] حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے زمانہ میں تھانہ بھون ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔

خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد ماجد مولانا حمد اللہ[1] رئیس شہر قاضی نجابت علی کے دوہرے داماد اور قاضی عنایت علی کے پھوپا تھے۔ باپ کی طرف سے حضرت مولانا کا شجرہ نسب ۳۴ واسطوں سے سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل جاتا ہے آپ کی والدہ مسماۃ بی صاحب بنت قاضی نجابت علی تھیں۔

پیدائش، تربیت اور والدین کے سایہ سے محرومی

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی ولادت ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ مطابق ۲ مئی ۱۸۱۵ء کو پیر کے دن ہوئی۔

آپ کے والد مولوی حمد اللہ جن کے آپ تنہا صاحبزادے تھے تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ جدی املاک اور جائداد بھی کافی تھی اس لئے آپ کو آنکھ کھولتے ہی ہر طرح کی آسائش نصیب ہوئی لیکن ان آسائشوں اور نازو نعم

---

[1] نزہت الخواطر جلد ۷ ص ۴۱۲ پر مولانا کے والد کا نام احمد اللہ تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے

[2] پورا شجرہ نسب یہ ہے: مولانا شیخ محمدؒ بن مولوی حمد اللہ بن حکیم محمد بخش بن قاضی حکیم محمد راحم بن حافظ محمد اعظم بن مکرم خان بن شیخ احمد عرف نواب فاروقی بن مولوی محمد صابر بن شیخ علی کلاں بن شیخ عبد اللہ بن شیخ سراج الدین بن قاضی چندن بن قاضی محمد موسیٰ بن قاضی نصر اللہ خان بن قاضی محمد یعقوب خان بن شیخ نظام الدین خشنی بن شیخ شہاب الدین بن معروف کرخی بن فرخ شاہ کابلی بن محمد شاہ کابلی بن نصیر الدین شاہ بن محمود شاہ بن مسعود شاہ بن شاہ عبد اللہ بن شاہ واعظ الاصغر بن شاہ واعظ الاکبر بن شاہ ابو الفتح بن شاہ محمد اسحٰق بن حضرت تاج الاولیاء سلطان ابراہیم بن ادہم قلندر۔ بن سلیمان بن ناصر الدین بن حضرت عبد اللہ بن امیر المومنین حضرت عمر فاروق خلیفہ دوم۔

کے باوجود آپ کی تربیت کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی گئی۔ بزرگوں کی توجہ اور اپنی پاک طینت کے سبب آپ شروع ہی سے نیکوکاری اور دینداری کی راہ پر گامزن رہے۔

بعض اور اکابر کی طرح آپ کو بھی نہایت کمسنی میں داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔ پانچ برس کی عمر میں آغوش مادری چھٹا۔ دس سال کا سن نہیں ہوا تھا کہ سایہ پدری سے محرومی نصیب ہوئی۔ آپ کے لئے یہ دونوں صدمے نہایت جانکاہ و جاں گسل تھے۔ سر پہ والدین کا سایہ نہ رہنے سے آپ کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے ذرائع بہ ظاہر منقطع ہو چکے تھے لیکن قدرت کا غیر محسوس ہاتھ جو کسی سبب اور ذریعہ کا محتاج نہیں اب بھی کشاں کشاں آپ کو بلند مقصد حیات کی طرف لے جا رہا تھا اور آپ کی فطرت سلیم جادۂ علم و معرفت میں برابر آپ کے لئے شمع راہ ثابت ہو رہی تھی۔

ابتدائی تعلیم آپ کی تعلیم کا آغاز والدین کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ آپ کے پدر بزرگوار مولوی حمداللہ خود عالم اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے اپنے نور عین کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام کیا۔ قدیم دستور کے مطابق چار پانچ سال کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ حافظہ تیز اور ذہن رسا تھا استادوں کی توجہ اور شفقت نے مل کر ان پر اور جلا کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں آپ کے جوہر ذاتی کھلنے لگے اور نہایت کمسنی میں آپ نے قرآن مجید مع تجوید حفظ

کرلیا۔ پھر فارسی پڑھی، بعدہٗ مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا قلندر بخش جلال آبادی سے عربی صرف و نحو کی تحصیل و تکمیل کی غرض دس گیارہ سال کے سن میں یہ سب مرحلے طے ہو گئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا معمولی سا تذکرہ نزہتہ الخواطر جلد ہفتم صفحہ ۱۲۴ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالہ سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وقراء علی مولانا عبدالرحیم تھانوی والشیخ قلندر بخش جلال آبادی

یہ دونوں بزرگ کون تھے اور ان کی علمیت کا کیا مرتبہ تھا ان باتوں کا کسی ذریعہ سے پتہ نہ چل سکا۔

دہلی کی حالت اور شاہ ولی اللہ کا اثر

حضرت مولانا کی طفلی کا دور ہندو پاکستان کی تاریخ کا وہ دور تھا جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا لیکن خود دہلی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی وہاں ہر طرح کے صاحب کمال حضرات کا اجتماع تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے علم کی جو شمع روشن کی تھی اس کو آپ کے تین نامور صاحبزادوں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور ان کی اولاد و احفاد نیز شاگردان و مریدان باصفا نے مزید روشنی عطا فرمائی اور اس کے لمعات سے برصغیر کے تمام گوشوں کو منور کر دیا۔

اسی خانوادہ ولی اللہی سے دو ایسی مبارک ہستیوں نے جنم لیا جو علم سے زیادہ عمل کی جانب مائل ہوئیں اور جنہوں نے وہ تحریک چلائی جو خالصتاً اسلام اور مسلمانان ہند و پاکستان کے احیاء اور ترقی کے لئے تھی۔ ان میں ایک مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بن شاہ عبدالغنیؒ امام ولی اللہ کے پوتے تھے۔ دوسرے حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی شاہ علم اللہ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ سے شرف تلمذ و بیعت حاصل تھا ان دو بزرگ ہستیوں میں جوش جہاد اس قدر فزوں تھا کہ انھوں نے اپنی مقدس زندگیاں اسی کے لئے وقف کر دیں اور جانسپاری و جاں نثاری کے وہ نمونے چھوڑ گئے جو رہتی دنیا تک ان کے ناموں کو زندہ رکھیں گے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے جہاد سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حکم سے شمالی ہند پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کر کے لوگوں سے جہاد کی بیعت لی اسی سلسلہ میں ان کا ورود مسعود تھانہ بھون میں بھی ہوا۔ اس وقت حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا عہد طفلی تھا لیکن وہ دور ایسا تھا جب دینی حمیت مسلمانوں کے بچے بچے میں موجود تھی چنانچہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مولاناؒ نے بھی سید صاحبؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی اس کا ذکر کئی جگہ نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے اسی رسالہ کے خاتمہ میں مرقوم ہے۔

"و قطع ازیں فقیر یاد دارد کہ عمرم ہفت سال باشد

خود در مسجد پیرجیوالی، واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور از اضلاع میان دو آب بہ شرف بیعت از خدمت جناب سید صاحب ممدوح قدس سرہٗ مشرف شد اگرچہ در ایام طفلی بودم اما پیر تو بزرگان کافی است و باز فیض روحی از دشاں می دارم۔"

ایک اور رسالہ ارشاد محمدی میں اسی واقعہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

"وجہ پیر صحبت معنوی بہ نسبت حضرت سید صاحب قبلہ مصدر المناقب قدس سرہٗ یہ ہے کہ فقیر کو ابتدائً بعمر ہفت سالگی اول شرف بیعت اور حاضری یک دو بار حلقہ توجہی حضرت سید صاحب ممدوح ہوا۔

تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر

حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورہ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ جن کو علوم دینیہ کی جانب پہلے ہی سے خاصی رغبت تھی اب اس جذبہ سے اور بھی سرشار ہو گئے ۱۰-۱۱ سال کی عمر تک تو وطن ہی میں رہ کر علم حاصل کیا لیکن جب اس سن کو پہنچے تو یہ دائرہ تنگ معلوم ہونے لگا اور اس چھوٹی سی عمر میں جب عام بچے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں آپ حصول علم کے شوق میں تن تنہا دہلی پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ عالم بقا

ہو چکے تھے اور ان کی مسند درس و تدریس کی زینت ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ تھے۔

حضرت مولاناؒ نے حضرت شاہ محمد اسحقؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[1]۔ اور حصول علم کی جانب اس قدر توجہ مبذول کی کہ آٹھ سال کی مدت میں علوم متداولہ کی تحصیل کر کے اٹھارہ سال کے سن میں شاہ صاحب سے سند فراغ حاصل کی اور علم کی دولت سے مالا مال ہو کر اپنے وطن واپس آئے۔

بالاکوٹ کا واقعہ اور حضرت شاہ محمد اسحٰق کا ہجرت فرمانا

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی دہلی سے واپسی کے ڈیڑھ سال پہلے (۷ مئی ۱۸۳۱ء کو) بالاکوٹ کا خونچکاں واقعہ رونما ہو چکا تھا

---

[1] نزہۃ الخواطر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مولانا نے علوم متعارفہ کی تحصیل شیخ مملوک علی نانوتوی سے اور منطق و حکمت کی تحصیل مولانا فضل حق خیرآبادی سے کی نزہت الخواطر کے الفاظ یہ ہیں:۔

ثم سار الی دھلی واخذ العلوم المتعارفۃ عن الشیخ المملوک العلی النانوتوی وقراء المنطق والحکمۃ عن العلامۃ فضل حق بن فضل امام الخیرآدی ثم لزم الشیخ اسحٰق بن افضل العمری الدھلوی واخذ عنہ الحدیث۔

اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد ناکامی پر منتج ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان سے قطع نظر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ جو اس تحریک کی قیادت فرما رہے تھے اس ناکامی سے اتنے برداشتہ خاطر ہوئے کہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں وہ اپنے برادر خورد حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے ہمراہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور اس تحریک کو چلانے کے لئے ایک بورڈ بنا گئے جس کی صدارت استاذ العصر مولانا مملوک علی کو سپرد کر دی گئی۔

دہلی سے واپسی کے بعد علمی سرگرمیاں

چونکہ مولانا حمد اللہ قصبہ کے ایک ذی حیثیت فرد تھے اور اتنی املاک و جائداد چھوڑ گئے تھے کہ اس سے بآسانی زندگی بسر کی جا سکتی تھی، اس لئے حضرت مولاناؒ کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد حصول معاش کی فکر نہیں کرنی پڑی اور آپ گھر پر رہ کر اپنی علمی قابلیت بڑھانے لگے اپنے مکان کے متصل حوض والی مسجد میں نماز با جماعت ادا کرتے وہیں طلباء کو درس دیتے اور اکثر و بیشتر عوام و خواص کو وعظ و پند سے مستفیض فرماتے۔[۱] تصنیف و تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا اس جانب بھی جلد ہی توجہ مبذول ہو گئی۔ غرض تھوڑے ہی عرصہ میں

۱؎ تذکرہ اپریل سنہ ۶۳ء

حضرت مولانا کی علمیت کا دور دور تک شہرہ ہوگیا۔ اور وہ ایک عالم دین کی حیثیت سے ہر جگہ متعارف ہوگئے۔

وطن میں حضرت مولاناؒ کے جتنے دوست اور ملنے والے تھے ان میں حضرت حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ دہلی میں آپ کے دوستوں اور مخلصوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ غالباً انھیں دوستوں کی کشش حضرت مولانا کو تحصیل علم کے بعد بھی اکثر دہلی تشریف لے جانے پر مجبور کرتی رہی اور اس مرکز علم و ادب سے آپ کے تعلقات ایسے وابستہ رہے کہ لوگ آپ کو دہلی کے طلباء مستعدین اور علماء دین میں شمار کرتے تھے ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء میں نواب صدیق حسن خاں بغرض حصول علم دہلی گئے تو اس وقت ان کی ملاقات جن حضرات سے ہوئی ان میں سے بعض کا ذکر مآثر صدیقی موسوم بہ سیرۃ والاجاہی حصہ دوم میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

طلباء مستعدین میں مولوی شیخ فیض الحسن صاحب سہارنپوری ملا نواب صاحب مقیم مکہ معظمہ، و مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی، مولوی ثناء الدین صاحب و مولوی شیخ محمد صاحب تھانوی و مولوی فضل حق خیرآبادی کے ساتھ ربط ضبط رہا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد بھی حضرت مولانا کے تعلقات دہلی کے اہل علم حضرات سے قائم رہے اور آپ کا وہاں اکثر آنا جانا

ہوتا رہا۔

دہلی سے بھی بعض دوست بغرض ملاقات آئے ہوں گے۔ لیکن اس کا کوئی زبانی یا تحریری ثبوت دستیاب نہیں ہوا تاہم حکیم مومن خاں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ حضرت مولانا اور حضرت حاجی امداد اللہؒ سے ملاقات کی غرض سے کئی مرتبہ تھانہ بھون آئے اور حضرت حاجی صاحبؒ کے مکان پر مقیم ہوئے۔[1]

شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار

وطن میں چند سال تک حضرت مولانا محض عالم دین کی حیثیت سے متعارف رہے۔ سوائے اس بیعت کے جو آپ نے اپنی سات سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر کی تھی اس وقت تک نہ آپ نے اور کسی سے بیعت کی اور نہ علم باطنی کی جانب مائل ہوئے درحقیقت بعض نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر آپ اس کوچہ میں آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آپ کے دل میں شریعت کا احترام اتنا تھا کہ طریقت سے اس کو فروتر کہنے یا سننے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے اور جب بعض متصوفین کو یہ کہتے سنتے کہ طریقت کے مقابلہ میں شریعت کیا چیز ہے یا طریقت اور شریعت کی راہیں جدا جدا ہیں تو آپ کے دل میں قدرتاً ان کے لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ راہ طریقت سے آپ گریزاں نہیں تھے لیکن اس کے لئے

---

[1] یہ روایت قاضی محمد یکرم صاحب مائل تھانوی سے ہم تک پہنچی ہے۔

شریعت کو بنیاد بنانا ضروری قرار دیتے تھے۔ شرح حزب البحر میں ایک جگہ اپنے اسی عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :-

"..... ایسے جاہل فقیروں اور درویشوں سے جو شریعت اور طریقت کو مخالف بتلاتے ہیں دور بھاگنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اُن کی صحبت میں یہ امید حصول عرفان اور وصل خداوندی کے اصل متاع ایمان جو باعث نجات اُخروی ہے ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ معاذ اللہ منہا....."

اسی احتیاط کا اقتضا تھا کہ آپ کسی پیر طریقت کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ جو آپ کے ہم جد[1] اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ جو آپ کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ کے زمرۂ مریدین میں شامل ہو چکے تھے وہ دونوں ازراہ دوستی مصر ہوتے کہ "آپ بھی حضرت میاں جیو سے بیعت ہو جائیے"! لیکن چونکہ حضرت مولانا کو میاں جیو کی علم شریعت سے واقفیت پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لئے آپ دونوں دوستوں کے مشورہ کو ہنسی میں ٹالتے رہے بلکہ ایک دو مرتبہ حضرت میاں جیو کی شان میں یہ الفاظ بھی کہہ گذرے۔

"واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا۔ مسجد کا میاں جی۔ میں اس سے کیا بیعت ہوں گا، جس کو علم شریعت سے بھی پوری آگاہی نہیں"

---

[1] حضرت حاجی امداد اللہؒ کا شجرۂ نسب بارھویں پشت میں یعنی قاضی چندن پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے شجرہ سے مل جاتا ہے۔

یا وہ تو مسجد کے ملا ہیں۔ ان سے کیا بیعت کروں گا"۔

حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رح سے بیعت

کچھ مدت اسی طرح گذر گئی اور حضرت مولانا راہ طریقت میں قدم نہ رکھ سکے۔ آخر وہ وقت آ گیا جب پیر کامل کی نظر فیض اثر نے آپ کی کیفیت، قلب کو یکسر بدل دیا، اور آپ نے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ پر چشتیہ صابریہ، نقشبندیہ اور قادریہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔

نسیم احمد جھنجھانوی اپنی مختصر تالیف "نور محمدی" میں حضرت مولانا شیخ محمد کے مرید ہونے کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی تو برادری کے بھائی تھے۔ مگر حضرت حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی ایک دوسرے کے حقیقی پھوپی دماموں زاد بھائی تھے! اور یہ تینوں حضرات فاروقی تھے۔ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب غیبی بشارت پاکر حضرت میاں جیو سے بیعت ہو گئے تو انہوں نے مولانا شیخ محمد صاحب کو بلایا کہ میں لوہاری میں جو جھنجھانہ کے ایک میاں جیو نور محمد صاحب ہیں ان سے بیعت ہو گیا ہوں تم بھی ان سے بیعت ہو جاؤ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب نے اپنے علم کی وجہ سے حضرت میاں جیو کی ایک قسم کی توہین کی کہ واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا مسجد کا میاں جی!" یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت میاں جیو

نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد میں جس کو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تشریف لے آئے حضرت حاجی صاحب نے مولانا شیخ محمد صاحب سے فرمایا کہ ہمارے شیخ آگئے ہیں جو کچھ تم کو پوچھنا ہو پوچھ لو اور آئندہ حضرت شیخ کی برائی نہ کرنا ورنہ دوستی میں فرق آجائیگا جس پر یہ دونوں حضرات میاں جیو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سورۂ رحمٰن کے متعلق سوال کیا حضرت میاں جیو نے فرمایا:۔

"میں تو مسجد کا میاں جی ہوں مجھے کیا خبر" مگر جب ان حضرات نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے شیخ محمد صاحب سے فرمایا:۔

"آنکھیں بند کر کے پھر میری آنکھوں کی طرف دیکھو"

حضرت شیخ محمد نے جو ایک بار آنکھیں بند کر کے کھولیں اور حضرت میاں جیو کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو حضرت کی آنکھوں میں ان کے سوال کا جواب لکھا ہوا تھا۔ پھر حضرت میاں جیو نے فرمایا:۔

"دیوار کی طرف دیکھو" تو سوال کا جواب دیوار پر بھی لکھا ہوا پایا۔

حضرت میاں جیو کی اس کرامت کو دیکھکر حضرت مولانا نے فوراً بیعت کرلی۔ اس واقعہ کو نسیم احمد صاحب ایک اور طرح بھی بیان کرتے ہیں۔

"بعض لوگوں سے اس طرح سنا ہے کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "وہ تو مسجد کے ملا ہیں" ایک جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضرت میاں جیو کی نظر ان (مولانا شیخ محمد) پر پڑی۔ مولانا تڑپ گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ لوگوں نے کہا "طبیب کو بلاؤ" ایک اہل دل اس مجمع میں

موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ ان میاںجیو صاحب سے کہو یہ علاج کریں گے حضرت سے درخواست کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ میں تو مسجد کا ملاہوں میں کیا جانوں،، دوسروں کے اصرار پر حضرت میاںجیو نے پانی پڑھ کر دیا۔ ہوش آگیا، اور وہ قدموں پر گر پڑے۔ اور حضرت سے بیعت کی درخواست کی حضرت نے بعد میں مرید فرمالیا"

بعض بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے۔

"حاجی صاحبؒ اور حافظ صاحبؒ نے میاںجیو نور محمدؒ سے بیعت ہونے کے بعد مولانا شیخ محمدؒ کو مشورہ دیا کہ وہ بھی میاںجیو کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جائیں۔ مولانا نے "مسجد کے ملاّ کی بھیتی کہہ کر ان کے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا بعدہٗ تین روز تک خواب میں بشارت ہوئی تو مولانا مثنوی معنوی کے چند اشعار کا مطلب میاںجیو صاحب سے دریافت کرکے ان کی علمیت اور بزرگی کے قائل ہوئے اور حلقہ مریدین میں داخل ہو گئے"

ان سب روایتوں میں جزوی اختلاف ہے۔ لیکن ہر ایک سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت مولاناؒ طریقت کے لئے شریعت کو ضروری خیال کرتے تھے اور ایک ایسے رہبر کے متلاشی تھے جو جامع شریعت و طریقت ہو۔ جب حضرت میاںجیو کو بخوبی جانچ اور پرکھ لیا اور آپ پر یہ امر منکشف ہوگیا کہ گو میاںجیو علوم شریعت سے بظاہر بہرہ وافی نہیں رکھتے تاہم

سلوک کی راہیں طے کرنے کے بعد ان کا سینہ ہر قسم کے علوم کے لئے خود بخود کھل گیا ہے تو آپ نے بغیر توقف حضرت میاں جیو سے بیعت کرلی اور بہت جلد خلیفہ مجاز کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات

حضرت مولانا شیخ محمد کو طریقہ نقشبندیہ سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی بہت جلد تکمیل کرلی۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا رجحان طریقہ چشتیہ صابریہ کی جانب زیادہ تھا۔ وہ دونوں اس طریقہ میں حضرت مولانا سے گوئے سبقت لے گئے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت میاں جیوؒ سے فیض حاصل کرنے کے علاوہ یہ تینوں پیر بھائی ایک دوسرے کو بھی فیض پہنچاتے تھے۔ حضرت مولانا نے رسالہ ارشاد محمدی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے۔

"اور ابتدا میں فقیر نے حسب ارشاد حضرت پیر و مرشد اصلی میاں جی صاحب نور الاسلام کے اپنے پیر بھائی حضرت حافظ ضامن علی شاہ صاحب تھانوی مرحوم و مغفور سے بھی کہ مجھ سے پہلے مرید حضرت میاں جیو صاحب کے تھے قدرے فیض صرف نسبت چشتیہ کا اٹھایا۔[1] علیٰ ہذا القیاس برادر دینی

---

[1] غالباً حضرت مولانا شیخ محمد کی اس عبارت سے ہی مولانا سید احمد فریدی امروہوی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پہلے حضرت حافظ ضامن سے روحانی فیض حاصل کیا بعدہٗ براہ راست حضرت میاں جیو سے بیعت ہوئے۔

پیر بھائی میرے جناب حاجی امداد اللہ شاہ صاحب تھانوی سلمہ اللہ تعالے نے بھی ان سے فیض اٹھایا اور بعد تکمیل نسبت نقشبندیہ مجددیہ عاجز کے حضرت حافظ صاحب مرحوم نے بعض امور نقشبندیہ کو فقیر سے دریافت فرما کر کاربند ہوئے تھے"

حضرت میانجیوؒ کی نگاہ میں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا مرتبہ

حضرت مولانا علوم ظاہری میں میانجیوؒ کے تمام مریدوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ بنابریں حضرت میانجیوؒ آپ کا بیحد لحاظ کرتے تھے۔ ملاقات کے موقع پر گفتگو میں اور مراسلت کے وقت خطوط میں آپ کے علمی مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہی پیرایہ اختیار کرتے تھے جو آپ کے شایان شان ہوتا تھا۔ حضرت میانجیو کے ایک خط کا ترجمہ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مولانا مولوی شیخ محمد صاحب فضیلت مآب کی خدمت گرامی میں! اللہ تعالیٰ ان کے شوق و ذوق کو جو معرفت خداوندی میں ہے زیادہ کرے۔ سلام ہو آپ پر اور اس شخص پر جو ہدایت اختیار کرتا ہے۔ اس فضیلت مآب مولانا کا گلشن شباب طاعات ایزدی کی آبیاری سے سرسبز ہو۔ داعی کے

سلہ نثر کا ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اشعار بجنسہ نقل کر دیئے گئے ہیں۔

دل کا بلبل ہر طرح سے ملاقات کے پھول کے شوق میں مترنم و مشتاق ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ ملاقات اوقات معینہ پر منحصر ہے۔ اپنے مقصد اصلی کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ سقائے سحاب نے آلام روزگار کی لو میں کملائے ہوئے قلوب کو حیات تازہ بخشی اور نہروں اور حوضوں کے رہنے والوں کو پانی کی موجوں کی بہجت آفرینی نے مثل شب بیدار صوفیوں کے جو حلقہ عبادت ڈال کر معبود حقیقی کے قسم قسم کے اذکار و اشغال میں لگے ہوئے ہیں اور نوا سنجان گلشن کو عروس بہار کی جلوہ گری سے بزم خرمی کے قوالوں کی طرح کھینچ کر انواع و اقسام کے دلفریب نغموں میں مشغول کیا ہے ؎

نبات از گوشۂ خود سر بر آورد
بیادِ حمد ایزد بار بر خورد
نہ ہے موسم کہ در ہر کشتِ زارے
شدہ آب رواں چوں نو بہارے

نامۂ مسرت کے انبساط انگیز مضمون کو دیکھ کر کہ اس کے ریحان الفاظ حسن و خوبی اور طرب ریزی کی وجہ سے نونہالان بوستان کی طرح ناز کرتے تھے۔ چشم دل نے طراوت تر و تازہ اور تازگی بے اندازہ پائی ؎

صبا رسید و دلِ غنچہ خنداں شد
شمیم لطفش درمانِ دردمنداں شد

اگرچہ پیمانۂ دل اس کی ارتیاح آیات کے بادۂ مکالمات سے خرم و شاد ہوا لیکن عارض حال نے خوش آئند قالون کی نوازش یعنی ظاہری گفتگو کے بغیر جو منشیٔ جان ہے اطمینان کلی نہ پایا۔ اللہ تعالےٰ جو جامع المتفرقتین ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی طرح زلال وصال کے متمنیوں کو ان کی مراد تک پہنچائے۔ اس استعداد و شوق کی وجہ سے جو جسمانی معانقہ و مصافحہ میسر نہ آنے کے سبب شدت اختیار کر گیا ہے۔ سورج کی تیز شعاعیں نوک قلم پر آکر اپنا اظہار کر رہی ہیں۔ مولانا غور کیجئے کہ پروانہ دیدار جمال شمع کے شوق میں پریشان رہتا ہے اور اس کی حرارت سے پرہیز نہیں کرتا جس وقت بلبل کو گلزار کے حسن دلنواز کے دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ پس اس صورت میں کہ ایسی مخلوقات کا یہ طریقہ وردیہ ہو بنی نوع انسان کا کیا ذکر جس کی پیدائش و خلقت نے تخم دوستی و محبت میں نشو و نما پائی ہے حاصل کلام یہ کہ تمام امور میں غم خواری اور محبت کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

رسالہ گل لالہ تصنیف کردہ اس مجمع کمالات کا (یعنی مولانا

شیخ محمدؒ کا) جو معارف ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے۔ فن تصوف میں ہے اور اس کا نام تنقیۃ[1] لاعتقاد و تصفیۃ الفواد من الکفر و الالحاد ہے میں اس کو دیکھنے کا بیحد شائق ہوں۔ وہ دن کتنا اچھا ہوگا۔ جب اس کے مشتاقان جمال کی آنکھیں اس کے مطالعہ کے کحل الجواہر سے روشن و منور ہوں گی۔

اس کے علاوہ مہربان مخلص دل حافظ جیو صاحب، حافظ ضامن علی کو اپنے پال گوپال کی جگہ سمجھ کر اس کے حال پر شفقت و مہربانی کی نظر رکھیں۔ اگر اتفاقاً بہ تقاضائے بشریت ان سے کوئی لغزش ہو تو سوائے معافی اور مہربانی کے وجہ ضمیر (ضمیر کے چہرہ) پر کوئی نقش نہ رہے۔ دل کی کدورت اور رنجش جسمانی کو ان اوراد و اشغال سے جو آپ کو بتلائے گئے ہیں صیقل توجہ سے پاک و صاف کر کے غیبی مہمانوں کے اترنے کی جگہ بنائیں (دل کو گرد کدورت سے صاف رکھیں) ؎

---

[1] غالباً حضرت مولاناؒ نے اس نام کا بھی کوئی رسالہ فن تصوف پر لکھا تھا۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا اس لئے آپ کی تصانیف کی فہرست میں اس کو شامل نہیں کیا گیا۔

دلت چو غنچہ بذکرش شگفتہ سر بادا
لبش بہ شبنمِ یادش چو برگ تر بادا
مشامِ جانِ من از کوئے او شمی یابد
وجودِ نخل زعشقش تو بار ور بادا

زیادہ بجز شوق کیا لکھا جائے۔ حافظ جیو صاحب، حاجی امداد اللہ صاحب و حافظ رفیع الدین صاحب اور مسجد کے اردگرد رہنے والے جملہ حضرات کو سلام مسنون الاسلام پہنچا دیں اور بندہ کے پاس اس وقت جو لوگ حاضر ہیں ان میں سے حافظ محمود نانوتوی عفی عنہ کی جانب سے مولوی صاحب، حافظ محمد ضامن صاحب، اور حافظ امداد اللہ صاحب کو بصد نیاز وانکسار آداب و تسلیمات پہنچے۔

حضرت میانجیو کا فیض روحانی اور وصال

حضرت مولانا کو اپنے پیر طریقت حضرت میانجیو نور محمد رح کی صحبت بہت کم نصیب ہوتی لیکن بمضمون "اما پیرِ تو بزرگاں کافی است" پیر کی نظر فیض اثر اس پر حضرت مولانا کی ذاتی صلاحیت دونوں نے مل کر چند ہی سال میں آپ کو کندن بنا دیا۔

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں حضرت میانجیو نور محمد رح کا بعمر ۸۵ سال وصال ہو گیا اور یہ تینوں پیر بھائی مسند ارشاد پر بیٹھے اور اپنے پرتو انوار سے ایک عالم کو منور کرنے لگے۔

حضرت میاںجیو کے وصال کے تقریباً چار سال بعد حضرت مولانا نے براہ ٹونک[1] حرمین

سفر حرمین الشریفین اور شاہ محمد یعقوبؒ سے اخذ فیض

شریفین کا سفر کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مکہ معظمہ کے دوران قیام میں حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ[2] کے برادر خورد حضرت شاہ محمد یعقوبؒ سے صحاح ستہ، تفسیر، فقہ وغیرہ کی سند حاصل کی اور ان تمام اشغال و اذکار کی اجازت پائی جو شاہ صاحب کو اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ سے پہنچے تھے۔ حضرت مولانا ارشاد محمدی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ۱۲۶۳ھ میں فقیر کو بعد شرف بیعت و صحبت اپنے بمقام مکہ معظمہ شرفہا اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب مہاجر مکیؒ، نواسہ اور خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اجازت عام اذکار و اشغال و اعمال جملہ ان طریقوں کے جو ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث رح

۱؎ نواب وزیر الدولہ نے احادیث تہذیب الاخلاق کی تالیف و تدوین کے لئے آپ کو بلایا تھا۔ آپ مکہ معظمہ جاتے ہوئے ٹونک تشریف لے گئے اور اس کام کو مکمل کر کے اسی سال حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۲؎ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کا انتقال ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶) میں ہوگیا تھا اور اس وقت حضرت شاہ محمد یعقوب حیات تھے۔ اس لئے حضرت مولانا نے ظاہری اور باطنی علوم میں ان ہی سے فیض حاصل کیا۔

قدس سرہٗ سے پہنچے تھے مع خرقہ کرتہ شریف اپنے کے ومعہ
سند مہری علم حدیث صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث اور
علم تفسیر وفقہ واصول حدیث اور تصوف باوجود حصول
سند علم موصوفہ فقیر کو بیشتر پیش نگاہ حضرت استاد مولانا
شیخ المشائخ آفاق مولانا مولوی محمد اسحٰق محدث مہاجر مکی
شاہ جہاں آبادی قدس سرہٗ سے جو برادر حقیقی کلاں
ان کے ہیں عطا فرمائے اور بعد توجہ دہی یہ بھی فرمایا کہ
اللہ اکبر تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے
اور تم کو اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی اور ہم میں اور
تمہارے پیر ومرشد اصلی میں یعنی مولانا نور الاسلام حضرت
میاں جیو نور محمد جھنجھانوی میں کسی طرح کا تفاوت نہیں"

اسی سفر سعید میں حضرت مولانا کو مسئلہ وحدت الوجود والشہود کے بارے میں بعض مکاشفات ہوئے جن کو آپ نے ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کرکے اپنی قلمی بیاض میں درج فرمایا۔ اس رسالہ کا نام پرانے عربی ناموں کے انداز پر "رسالہ الہامات الوجود والودود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود" رکھا۔ یہ وہی رسالہ ہے جو اس وقت ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے[1]

حج سے واپسی کے موقع پر حضرت مولانا فرقہ شاذلیہ کے سرخیل

---

[1] یہ رسالہ ایک مرتبہ پہلے بھی طبع ہوچکا ہے۔ مگر اب بالکل نایاب ہے۔

حضرت امام ابوالحسن شاذلی یمنی کے مزار واقع مخہ[1] (یمن) پر تشریف لے گئے۔ شرح حزب البحر کی تمہید میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمائے ہیں:۔

"فقیر نے وقت واپسی کے حرمین شریفین سے ۱۲۶۶ھ
بارہ سو ترسٹھ ہجری علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں ان کے
مرقد منور کی زیارت کی"

بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے امام فخرالدین رازی کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ نے اس کو پڑھا تو بیحد متاسف ہوئے۔ اور دہلی پہنچنے سے پہلے اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کرلی جس کا نام "مناظرہ محمدیہ" رکھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے اس کو بہت پسند کیا اور اس پر تقریظ لکھی۔

حج سے واپسی کے بعد

سفر حج سے وطن واپس آئے تو آپ نے پیر محمد والی مسجد میں رہنا اختیار کیا۔ یہیں حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ ضامن شہید کا قیام تھا۔ ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اور اس لئے کہ مختلف مشائخ مثلاً حضرت محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون اور حضرت مفتی الٰہی بخش مصنف مثنوی تکملہ دفتر ششم نے یہیں باطنی فیوض حاصل کئے تھے یہ مسجد "دوکان معرفت" کہلاتی تھی۔

---

[1] مخہ یا موخا یمن کا مشہور شہر ہے۔ یہاں کا قہوہ بہترین سمجھا جاتا ہے۔

یہاں دن رات علم و عرفان اور ذکر و فکر سے محفلیں گرم رہتی تھیں حکیم محمد عمر چیرتھاولی نے نہایت مسجع و مقفیٰ عبارت میں اس مسجد کا نقشہ پیش کیا ہے:۔

"سبحان اللہ و بحمد اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہِ قدسی نفساں تھی۔ ہمپایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے۔ ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک طرف شمال کے حجرے میں "مثال قطب شمالی، عاشق ذو الجلال شہید لم یزلی، ولیٔ ازلی، حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطانِ زمین ولایت و کرامت، ماہِ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرم قال اللہ و قال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کو گرتے پڑتوں کے تھامنے کو، مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس سرہٗ الخالق..... کبھی درس و تدریس طلبہ میں..... کبھی مشاہدات ذات و سلطان الاذکار میں مستغرق....."[1]

یہ نقشہ تو ان حضرات کی روحانی زندگی کا تھا۔ اب آپس کی بے تکلفی

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔ تینوں بزرگ بچپن کے دوست تھے۔ اس وقت جو تعلقات قائم ہو گئے تھے اور جس بے تکلفی کا مظاہرہ وہ عہد طفلی میں کرتے تھے مسند رشد و ہدایت پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ارواح ثلثہ کی درج ذیل حکایت ان قدسی نفسوں کی پاک زندگیوں کے اسی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔

فرمایا کہ:۔

جب حاجی صاحب یہاں یعنی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں تشریف رکھتے تھے تو ایک کچھالی میں کچھ چنے، کچھ کشمش ملی ہوئی رکھتے تھے۔ صبح کے وقت مولانا شیخ محمد صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے۔ اور آپس میں خوب چھینا جھپٹی ہوا کرتی تھی۔ بھاگے بھاگے پھرتے تھے اس وقت مشائخ اس مسجد کو "دوکان معرفت" کہتے تھے اور تینوں کو اقطاب ثلثہ، حضرت حاجی صاحب دہلی کے شہزادوں میں اور علماء میں بزرگ مشہور تھے۔ مگر پیر بھائیوں میں چھینا جھپٹی کرتے تھے۔[1]

حضرت مولانا رشید احمدؒ سے مناظرہ

حضرت مولاناؒ کی مکہ معظمہ سے واپسی

---

[1] ارواح ثلثہ۔

کے چند روز بعد غالباً ۱۲۶۴ھ یا ۱۲۶۵ھ میں آپ کے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مابین کسی حدیث کے بارے میں کچھ اختلاف ہو گیا بات معمولی سی تھی لیکن مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے اپنی تالیف تذکرۃ الرشید میں جو حضرت مولانا رشید احمدؒ کی سوانح حیات ہے اپنے ممدوح کو اوائل عمر ہی سے سلیم و حلیم اور معصوم عن الخطا ثابت کرنے کے لئے واقعات میں اس قدر رنگ آمیزی کی کہ اس سے حضرت مولانا شیخ محمد کی شخصیت داغدار ہو کر رہ گئی۔

اس واقعہ کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں فریقوں کی شخصیتوں کو واضح کر دیا جائے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے جو حالات اب تک بتائے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اس بحث یا نام نہاد مناظرہ کے وقت تقریباً ۳۵ سال تھی۔ آپ کا علمی مرتبہ ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا تھا حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل کی تھی اور حضرت میاں جیو نور محمدؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوبؒ سے باطنی فیض حاصل کیا تھا۔ پھر شروع ہی سے حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ ضامنؒ کی صحبت میں رہتے تھے اور راہ سلوک میں وہ بلند مقام حاصل کر چکے تھے جہاں پہنچکر بقول حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب۔

"تم کو اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی"

ان کے مقابلہ میں حضرت مولانا رشید احمدؒ شباب کی ابتدائی منزل

صاحب
سے گذر رہے تھے۔ بیس اکیس سال کا سن تھا اور بقول تذکرۃ الرشید
"فارغ التحصیل اور فاضلہ ہونے کے علاوہ صاف گو، تحریر
و تقریر میں بیباک، جوان طبیعت، تازہ علم اور سب
پر طرہ یہ کہ حق بات کہنے اور مناظرہ اور مباحثہ میں مرد
دلیر و نڈر اس لئے آپ کا قلم نہ رکا اور جو لکھنا تھا صاف
صاف لکھ دیا"

شباب اور جوان العمری کی ان غیر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ابھی تک باطنی علم سے بے بہرہ اور مولانا عاشق الٰہی کے اس فقرہ کے مصداق تھے
"مگر علم کا غلبہ تھا اور عمل کے لئے تفقہ لازم نہیں"

اس پس منظر کے ساتھ اب واقعات کی کڑیوں کو ملایا جائے تو پوری داستان اس طرح مرتب ہوتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد نے جن کا علم حدیث میں پایہ ہمیشہ بلند سمجھا جاتا رہا ہے کسی حدیث سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا۔ قاعدہ ہے کہ نوجوان جو تازہ تازہ کسی درس گاہ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، جا و بیجا اپنی علمیت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمدؒ کا بھی وہی دور تھا انہوں نے جوش میں آکر حضرت مولانا شیخ محمد کی رائے کی تردید کردی۔ حضرت مولانا نے اس کا نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ایک علمی بحث میں حضرت مولانا رشید احمد کا بھی وہی انداز ہونا چاہئے تھا لیکن جوانی کی ترنگ میں جواب الجواب کے ساتھ ساتھ ثقاہت کے درجہ سے گرا ہوا یہ شعر بھی لکھ گئے ؎

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے[1]

ہر صاحب ذوق اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شعر کو ایسی بحث میں جو حدیث اور فقہ سے متعلق تھی پیش کرنا غلط اقدام تھا یا اس کو پڑھ کر برافروختہ ہونا تفقہ اور تورّع خلاف تھا۔ اس بات کا اعتراف خود مولانا عاشق الٰہی کو بھی ہے کہ

"مولانا کا لکھا ہوا شعر چونکہ زیادہ ناگوار گذرا اس لئے خفا ہوئے اور جو کچھ زبان پر آیا کہا"

مگر چونکہ حضرت مولانا رشید احمدؒ ان کے ممدوح ہیں اس لئے فیصلہ ان کے حق میں اور حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے خلاف ان الفاظ میں سنا دیتے ہیں۔

"مگر علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں غلطی و

---

[1] اس قسم کے اشعار ایسے معرکوں کی رونق کو تو بڑھا سکتے ہیں۔ جیسا انشا اور مرزا عظیم کے مابین ہوا تھا اور جس کا نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس معرکہ میں عظیم بیگ نے انشا کے پھکڑپن کا جو جواب ایک مخمس کے ذریعہ دیا اس کے ایک بند کا ٹیپ اسی شعر کا دوسرا مصرع ہے ملاحظہ ہو:۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق ؛ تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق ؛ شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

خطا سے معصومیت ضروری نہیں[1]۔ اس لئے حقیقتاً اس مسئلہ
کے اندر چوکے اور لغزش کھائی "

بہر حال جب تحریر سے کام نہ چلا تو حضرت مولانا رشید احمدؒ زبانی مناظرہ
کے لئے کھانہ بھون پہنچے لیکن حضرت مولانا سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی
حاجی امداد اللہؒ کے مرید ہو گئے۔ اور انہوں نے مناظرہ سے روک دیا۔

---

[1] مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے یہ بات نہایت اصولی بیان فرمائی ہے، لیکن اگر وہ اسی اصول کو سب جگہ برتتے تو وہ اصول تھا ورنہ بے اصولی کے سوا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے، حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے متعلق تو یہ اصول بیان کرتے کہ غلطی و خطا سے معصومیت ضروری نہیں جگہ جگہ ان کی غلطیاں گنا دیتے ہیں اور حضرت مولانا رشید احمد کی زبانی یہ الفاظ کہلواتے کہ

خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب اور حافظ صاحب جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کر کر ان پر عامل تھے، بندے کے کہنے سے کتنے ہی مسائل کے تارک ہو گئے اور واللہ کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ہم کو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا ہے"

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو زیور علم تک سے عاری کرنا چاہتے ہیں، اور جہاں اپنے ممدوحین کا ذکر آتا ہے وہاں ان کی لغزشوں کے لئے حسین توجیہات پیش کر دیتے ہیں۔

جنگ آزادی کے شروع میں تھانہ بھون کی حالت

اس واقعہ کے بعد سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ تک کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ دور بھی حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے علمی مشاغل اور عبادت وریاضت میں گزارا۔ ان ایام میں ہی گنج آنا جانا ہوتا رہا۔ نواب صدیق حسن سے اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی جس کا ذکر پیشتر کسی موقعہ پر کیا جا چکا ہے۔

۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں وہ ہنگامہ بلاخیز رونما ہوا جس کو برطانوی عہد میں ہمیشہ غدر کا نام دے کر بدنام کیا جاتا رہا، لیکن اب اسی کو محبان وطن کی جان فروشی کا ایک بے بدل کارنامہ بتاکر جنگ آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ ہنگامہ کس طرح شروع ہوا اور ملک کے مختلف گوشوں میں کیسے پھیلا ان باتوں کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اس امر کا اظہار کر دینا ناگزیر ہے کہ عام ہنگامہ کے دوران تھانہ بھون کی فضا پرسکون رہی۔ زبانی روایتوں سے اس کے دو وجوہ معلوم ہوئے ہیں[1]۔

(۱) قاضی سعادت علی جو قاضی عنایت علی کے والد تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہ چکے تھے، اس لئے ان کو اور ان کے صاحبزادوں کو کمپنی کی وفاداری ملحوظ تھی۔

(۲) قاضی عنایت علی نے اپنے زمانہ میں کمپنی کے وفادار رہنے کا معاہدہ

---

[1] قاضی محمد نادر صاحب مائل تھانوی کی زبانی روایت ہے۔

کیا تھا جس کو نباہنا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

حقیقت کچھ ہو یہ امر اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ تین چار ماہ تک ملک کے مختلف حصوں میں جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے، لیکن تھانہ بھون میں اس کی ایک ہلکی سی چنگاری بھی نہیں پہنچی۔ اس مثالی امن و امان کے قیام کا سہرا قاضی عنایت علی کے سر ہے[1]

قاضی عنایت علی قصبہ کے ذی اثر رئیس تھے اور وہ اپنی ریاست کا انتظام و انصرام نہایت قابلیت سے کر رہے تھے۔ قصبہ کے لوگ ان کی خوش تدبیری اور حسن سلوک سے ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ امن و امان قائم رکھنے میں سب نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔

---

[1] مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علماء ہند نے "علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ علمائے تھانہ بھون نے جن کے سربراہ حضرت حاجی امداد اللہ تھے میرٹھ اور دہلی کے ہنگاموں کی خبر پاتے ہی جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو دہلی بھیجا تھا مگر وہ جہاد کی کوئی صورت بنتے نہ دیکھ کر واپس آ گئے۔

مولانا نے محض ظن و تخمین کی بنیاد پر یہ تمام عمارت کھڑی کی ہے ورنہ انہیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملا H. G. KEENE کے مرتب کردہ حالات سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاملی کا زمیندار تحصیل دار ابراہیم خاں کا مخالف تھا، اور بادشاہ دہلی سے ساز باز کر رہا تھا۔ اسی لئے انگریزوں کو شاملی کی حفاظت کے لئے کافی انتظامات کرنے اور وہاں سپاہی اور اسلحہ جات رکھنے پڑے۔ تھانہ بھون کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا اس لئے وہاں کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

تھانہ بھون میں جہاد کے اسباب واقعات اور نتائج

تین چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا جس نے تھانہ بھون کے اس شمالی امن کو ختم کر دیا اور جنگ کے جو شعلے ملک کے دوسرے حصوں میں بھڑک رہے تھے انہوں نے اس قصبہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر یہاں کی خوشحالی اور سکون و اطمینان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

یہ حادثہ اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ قاضی عنایت علی کے برادر خورد قاضی عبدالرحیم جو بڑے بھائی کو باپ کے مثل سمجھتے تھے اور ریاست کے کاموں سے علیحدہ رہ کر امیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی غرض سے مع چند احباب و رفقاء سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں سرائے میں مقیم ہوئے۔ تھانہ بھون کے ایک کائستھ نے جو کلکٹری میں سر رشتہ دار تھا، کسی خاندانی چشمک و عداوت کی بنا پر حاکم ضلع رابرٹ اسپنکی سے شکایت کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی سے باغی ہو گیا ہے اور دہلی کے باغیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے سامان حرب خریدنے کے لئے سہارنپور آیا ہے۔

یہ دور ایسا تھا جب معمولی سے شبہ پر دار و رسن کی تیاری ہو جاتی تھی، انگریز باغی اور بغاوت کے نام سے بھڑکتا تھا۔[1] قدرتی طور پر اسپنکی کو کچھ شک اور

---

[1] سہارنپور میں اس وقت جو حالات گذر رہے تھے ان کا مفصل تذکرہ
۱۰۳ SOME ACCOUNT OF THE کی کتاب HENRY GEORGE KEENE
(باقی زیر صفحہ ۴۸ پر)

کچھ یقین ہوا، پھر بھی اس نے حقیقت حال معلوم کرنی چاہی مگر جب مقدر ہی برگشتہ تھا تو اس کی کوشش کس طرح اچھے نتائج پیدا کر سکتی تھی، خود قاضی عبدالرحیم کے بعض ہمدردوں نے بے رخی اختیار کی اور کلکٹر سے مرعوب ہو کر کچھ ایسے جوابات دئیے جن سے اس کے یقین میں جو تھوڑی بہت کمی تھی وہ بھی جاتی رہی اور قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقا کو وقت کے قانون کے مطابق موت کی سزا دیدی گئی۔ یہ خبر وحشت اثر ہوا فانا تھانہ بھون جا پہنچی، قاضی عنایت علی اپنے عزیز بھائی کے اس مظلومی کے ساتھ مارے جانے کا حال سن کر متاع ہوش و حواس کھو بیٹھے اور جذبہ انتقام سے سرشار ہو کر انگریزوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسپنکی کو اطلاع ملی تو وہ اپنے اس عاجلانہ اقدام پر بہت پشیمان ہوا، اس نے قاضی عنایت علی سے اپنے دلی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہلوایا کہ:۔

> "یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے، آپ صبر و شکیب سے کام لیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ ہم آپ کو مزید جاگیر دیں۔"

ADMINISTRATION OF INDIAN DISTRICTS DURING THE REVOLT OF BENGAL ARMY. کے باب اول میں ملاحظہ فرمائیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا محمد میاں صاحب نے کس بنیاد پر لکھ دیا کہ "ہاتھی خرید کر دہلی بھیجنے کی اطلاع کچھ غلط نہیں تھی"

— (٭) —

عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کر لیں گے۔"

سنا ہے کہ بعض عزیزوں اور خیر خواہوں نے بھی قاضی عنایت علی کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور جذبۂ انتقام سے ایسے مغلوب ہو گئے کہ اپنے انجام پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ان کے لئے اس وقت صبر کرنا مشکل بھی تھا، اس لئے کہ جس بھائی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور جو بھائی ان کا صحیح معنوں میں دست و بازو تھا وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا جانکاہ تھا کہ اس کی وجہ سے قاضی صاحب جو کچھ کر گذرتے کم تھا، چنانچہ انہوں نے اسپنکی کی پیشکش اور عزیزوں کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور لڑائی کے منصوبے بنانے شروع کر دئے۔ یہ دیکھ کر قصبہ کے مقتدر حضرات نے جنگی مہمات کو ترتیب دینے کے لئے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں قرب و جوار کے قصبوں سے اس زمانہ کے تمام نامی گرامی علماء بلائے گئے۔ اراکین مجلس میں سے بعض کے نام یہ ہیں :-

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا شیخ محمد، حافظ محمد ضامن علی، شاہ مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی[1]۔

---

[1] ان ہی اکابر میں سے اکثر نے شاملی کے معرکہ میں حصہ لیا تھا۔ حیرت ہے کہ سرسید نے ان مقدس روحوں کے لئے مفسد کا لفظ استعمال کیا ہے ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں ؛ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس شورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر جنگ کی جائے تو اس کو جہاد کہا جائے گا یا نہیں۔ حضرت مولانا شیخ محمدؒ اور حضرت مولانا محمد حسنؒ کا اجتہاد یہ تھا کہ اس جنگ کو جہاد نہیں کہا جا سکتا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی ایک دلیل یہ تھی کہ :-

"جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے"

مولانا شیخ محمدؒ کا اجتہاد صحیح تھا یا غلط اس کا علم تو خدا کو ہے تاہم ایک معتبر ذریعہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی یہ رائے معلوم ہوتی ہے

"نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، بظاہر تو اس کو جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا"

حکیم الامت کے اس فتویٰ سے حضرت مولانا پر سے یہ اعتراض خود بخود ہٹ جاتا ہے کہ آپ نے اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر اس کو جہاد کہنے سے انکار کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی رائے سراسر حقانیت پر مبنی تھی ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو اپنے ماموں زاد بھائی اور برادر نسبتی قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پا جانے کا اتنا بھی صدمہ نہیں تھا جتنا حضرت مولانا قاسمؒ کو تھا سچ پوچھئے تو حضرت مولاناؒ کا یہ ذاتی معاملہ تھا، لیکن چونکہ آپ اپنے زمانہ کے ایک بڑے عالم تھے اور علمائے حق کے لئے شریعت کے مقابلہ میں ذاتی

معاملات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس لئے آپ نے جو بات حق سمجھی اس کو ظاہر کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

بہر حال حضرت مولانا کا اپنا ہی اجتہاد تھا جس کو مجلس شوریٰ کے دیگر اراکین نے تسلیم نہیں کیا اور متفقہ طور پر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دست حق پرست پر جہاد کی بیعت کی گئی۔ اسی وقت سے انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا اور قصبہ میں شرعی حکومت قائم ہو گئی حضرت حاجی صاحبؒ اس کے امیر مقرر ہوئے[1]

جہاد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قاضی عنایت علی نے اپنے چند آدمیوں کی ہمراہی میں انگریزوں کے وہ اسلحہ اور کارتوس جو بہنگیوں میں سہارنپور سے کیرانہ لیجائے جا رہے تھے چھین لئے۔ انگریز افسر جو ساتھ تھے مقابلہ میں آکر مارے گئے۔ سہارنپور اور مظفر نگر کے حکام کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بدلہ لینے کے لئے موقعہ کے منتظر رہے۔

اس وقت شاملی تجارتی منڈی ہونے کے اعتبار سے نیز بعض

---

[1] مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے مصلحت وقت کے پیش نظر واقعات اس انداز سے بیان کئے ہیں کہ ان کی تحریر بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شرعی حکومت کا نفاذ کس وقت سے ہوا مولانا محمد میاں صاحب محض قیاس کی بنا پر تحریر فرماتے ہیں کہ دہلی میں لڑائی شروع ہونے کے کچھ روز بعد ہی شرعی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ لیکن قرین صواب یہی روایت ہے کہ اس حکومت کا قیام مجلس شوریٰ کے بعد عمل میں آیا۔

اور وجوہ سے ایک اہم جگہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی مہر سنگھ اس قصبہ کا بڑا زمیندار اور ذی اثر رئیس تھا۔ ابراہیم خاں سب کلکٹر (تحصیلدار) سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے، چنانچہ اس نے شاہ دہلی سے نامہ و پیام شروع کیا۔ انگریز حکام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کیں۔ گرانٹ[1] پہلے سے کچھ سواروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اوائل ستمبر میں حاکم ضلع آر۔ ایم ایڈورڈس نے کچھ پیدل فوج اور دو توپیں اس کی مدد کے لئے بھیجدیں۔ اس کے بعد ایڈورڈس خود بھی پہنچ گیا لیکن ۱۴ ستمبر کو وہ فرسٹ پنجاب کیولری کے تقریباً ۱۰۰ ہتھیار بند آدمی سب کلکٹر ابراہیم خاں کی مدد کے لئے چھوڑ کر بڑھانہ کے قلعہ کی طرف چلا گیا اور اس

---

[1] سی گرانٹ ضلع مظفر نگر کا جائنٹ مجسٹریٹ تھا، اس نے جنگ آزادی کے بعد ابراہیم خاں کے بیٹے کی درخواست پر اس کو ایک سرٹیفکیٹ دیا تھا جس میں ابراہیم خاں کی خدمات کو سراہا تھا اور اس کی وفاداری کی تعریف کی تھی اسی سرٹیفکیٹ میں گرانٹ لکھتا ہے :۔

"خصوصاً شروع اس غدر میرٹھ سے ہم شاملی کو تشریف لے گئے تھے اور دو روز ماہ جون اور بارہ روز ماہ جولائی اور چودہ روز ماہ ستمبر ہم وہاں مقیم رہے۔۔۔۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ ستمبر میں بھی ۱۴ روز تک گرانٹ کا قیام شاملی میں رہا مگر مجاہدین کے حملے کے وقت وہ یقیناً وہاں موجود نہیں تھا کیونکہ اس نے خود اپنی موجودگی کا اظہار کیا ہے اور نہ سرٹیفکیٹ میں اس کے متعلق کچھ لکھا ہے۔

آسانی سے قابض ہو گیا۔ اس کی دم موجودگی میں مجاہدین تھانہ بھون یلغار کر کے شاملی پہنچ گئے اور تحصیل پر جو ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت رکھتی تھی، حملہ آور ہوئے۔ یہ معرکہ نہایت سخت تھا لیکن مجاہدین نے دلیری و جرأت سے کام لے کر تحصیل کا پھاٹک توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔

انگریز وقائع نگار ہنری جارج کین کا بیان ہے کہ :۔

لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اور کچھ خانہ بدوش بھی ان کی طرف آملے تھے اس لئے ان کا پلہ بھاری رہا۔ انہوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطہ کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگا دی۔ محصورین میں سے ۱۱۳ آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خاں سب کلکٹر بھی تھا۔"

علمائے ہند کے شاندار ماضی میں تحریر ہے کہ :۔

"لڑائی تین دن تک جاری رہی، جس میں مجاہدین کا بہت نقصان ہوا۔ تیسرے دن حضرت حافظ ضامن علی شاہؒ نے سرفروشی کو کام میں لاکر تحصیل کا دروازہ توڑ دیا اور خود انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہو گئے۔

سرسید مرحوم اس جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :۔

"ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے

جس کا افسر قاضی عنایت علی تھا فساد برپا کر دیا اور ایک بڑے
گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی
میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالہ کے اور اٹھائیس سپاہی
جیل خانہ کے اور پچاس سے زاید سپاہی متعینہ تھانہ اور
تحصیل کے باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خاں
اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے اور وہاں موجود
تھے۔ یہ افسر بہ کمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور
تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا
اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کناں کو ہٹا دیا اور بہت سے
آدمی ان میں کے مارے گئے۔ آخر کو گولی و باروت تحصیل
میں ختم ہو گئی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں
کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے۔ یہاں تک
کہ تحصیل میں گھس آئے، وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر
نہایت بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام
آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کیا۔ یہ قتل و خونریزی شاملی
میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی، جو دن کہ فتح دہلی کا تھا
مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح
دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس
ہنگامہ میں ۱۱۳ آدمی جن میں سے زیادہ مسلمان تھے کام

آئے اور ہر ایک تمغۂ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ ہے جس کا مفسدانِ تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلہ میں آئے اور دو بدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے[1]۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے

---

[1] اگر وہ نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے ہوتے تو انگریز کی خیر خواہی میں ان کے خلاف سینہ سپر نہ ہوتے۔ مجاہدین کا مقابلہ انگریز سے تھا نہ کہ ابراہیم خاں یا اس کے رفقاء سے۔ اب اگر یہ لوگ خود اس حملہ کا جواب دینے کے لئے میدان میں نکل آئے تو اس میں مجاہدین کا کیا قصور تھا۔ ابراہیم خاں اور اس کے رفقاء میں اگر دین کا پاس و لحاظ تھا تو ان کو چاہئے تھا کہ میدان سے ہٹ جاتے مگر بقول گرانٹ :-

"جب گروہ باغیوں کا جس میں غازی دانا نگر وغیرہ قصبہ جات کے کثرت سے تھے بسرداری قاضی عنایت علی خاں کے تحصیل پر چڑھ آئے اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ باوجود اس کے تحصیلدار نے ان کا مقابلہ کیا....."

ایسی صورت میں اگر مجاہدین جنگ سے دستبردار ہو جاتے تو حصول مقصد کے لئے اور

کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ
کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا"....

غرض شاملی کی فتح نے وقتی طور پہ انگریزی حکومت کو دبنے پہ مجبور کر دیا۔ مجاہدین اس نمایاں کامیابی کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے اور حضرت حافظ ضامن شہید کے جسدِ مبارک کو لاکر آسودۂ خاک کیا۔ آپ کا مزار پر انوار شہر سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے بیرون کے باغات کے درمیان واقع ہے۔ چار دیواری چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ آج بھی خاک و خشت کے اس انبار سے طرح طرح کی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ایڈورڈس برٹھانہ کے قلعہ کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ سکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہو گی، لیکن راستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پہ مجاہدین کے قبضہ کی اطلاع ملی اس نے اس ناراجی کا بدلہ لینے کے لئے اسی وقت تھانہ بھون پہ حملہ کرنا چاہا لیکن یہ معلوم کر کے کہ مظفر نگر کی حالت زیادہ تشویشناک ہے وہ تھانہ بھون کو چھوڑ

کیا صورت اختیار کرتے، درحقیقت ابراہیم خاں اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کا حوالہ دے کر لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے: ورنہ ابراہیم خاں کا جذبہ ایمانی تو سرسید کے اسی فقرہ سے جھلک رہا ہے" مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے گمان تک مژدہ فتح نہ ملی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا"

کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا، ادھر ایڈورڈس نے مظفر نگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کئے۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر تھانہ بھون کی جانب توجہ کی۔ ان ہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارنپور (رابرٹ اسپنکی) کے پاس سے کمک آگئی اور کمشنر مذکور کا اشارہ پاکر ایڈورس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کل کتنی فوج تھی۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس میں کچھ سکھ پیدل اور سوار۔ کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں۔ اس فوج کے ساتھ دو سول افسر بھی تھے ایک سوپرنٹنڈنٹ میلول اور دوسرا ملکم لو موخرالذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔

ایڈورڈس نے دن اور تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ حملہ ۱۶ ستمبر کے بعد ہوا تھا۔

کپتان اسمتھ اور لفٹننٹ کوٹیار کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہو گئی؛ لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزی فوج کے ۱۷ آدمی مارے گئے اور ۲۵ زخمی ہوئے جن میں دو افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلول اور لو نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر نکال لے گئے۔ حالانکہ خود لو ایک معرکہ میں زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی فوج کو لئے

ہوئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں سے گذر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا، دست بدست لڑائی ہوئی جس میں اس کے تلوار کے تین نہایت گہرے زخم آئے۔

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی ڈال دی، کمشنر اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو متہم کرنا شروع کیا لیکن کین کی رائے ہے کہ اس سانحہ کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پر عاید ہوتی ہے، اس لئے کہ اسی نے تھوڑی سی فوج بھیجکر ایڈورڈس کو یہ نادرشاہی حکم دیا تھا کہ :-

"فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر کچل دو"

مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کردئے گئے ہیں تو اس نے حملہ کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا، اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جا چکا تھا اور پسپا بھی ہو گیا تھا

بہرحال اس شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مزید کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریزی فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے شاملہ بھون پر قبضہ کرلیا۔[1] مجاہدین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں

---

[1] یہ واقعات کین کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ دوسرے ذرائع کو چھوڑ کر ہم نے ایک انگریز کے تحریر کردہ واقعات کو کتاب کے متن میں اس لئے شامل کرنا مناسب سمجھا کہ قارئین دیکھ لیں کہ مصنف کے تعصب کے باوجود مجاہدین کے جوش

کی طرف چلے گئے۔

قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد انگریزی فوج نے تھانہ بھون کو جس بری طرح تباہ و برباد کیا اس کی صحیح تصویر مولانا عاشق الٰہی کے بیان میں ملاحظہ فرمائیں۔

"صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے درماں ساتھ لائی تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی سمت سے

---

۱۴ اور ان کے عظیم کارناموں کی ایک ہلکی سی جھلک اس کے بیان میں بھی موجود ہے لیکن کا بیان اس معاملہ میں مولانا محمد میاں کے بیان کے مطابق ہے یہ دونوں مصنف حملوں کی تعداد دو بتاتے ہیں۔ قاضی محمد مکرم صاحب مائل کے بیان کے مطابق قصبہ پر کل چار حملے ہوئے۔

پہلے حملے میں ایک ہزار سپاہی اور چھ توپیں تھیں۔ جلال آباد اور تھانہ بھون کے راستہ پر مجاہدین نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پسپا کر دیا۔

دوسرا حملہ دو ہزار فوج سے ہوا اس میں بھی چھ توپیں تھیں، مجاہدین نے بہادری سے مقابلہ کر کے اس حملہ کو بھی ناکام بنا دیا۔ توپوں سے محض دو گولے چلنے کی نوبت آئی تھی کہ مجاہدین نے ان کو بیکار کر دیا اور انگریزی فوج اس مرتبہ بھی ہزیمت خوردہ واپس ہو گئی۔

تیسرا حملہ زیادہ سخت تھا۔ اس مرتبہ انگریزی فوج کی تعداد چھ ہزار تھی اور پورا توپ خانہ مع گولا بارود ساتھ تھا۔ یہ فوج بڑھتی ہوئی حوض والی

گولا باری شروع ہو گئی۔ دن ہوا تو فوج قصبہ میں
داخل ہوئی۔ قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا رات
کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے
مسمار کر دیئے گئے۔ اور مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ
لگا دی گئی ...... حاکم ضلع کا وہ قول صحیح ہوا کہ اسی
طرح تھانہ بھون کو مسمار کرا کر چھوڑوں گا"

وفاداران سرکاری کو دل کھول کر انعامات سے نوازا گیا اور جن کو باغی سمجھا گیا ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔

دیگر مجاہدین کی طرح قاضی عنایت علی نے بھی اپنے وطن کو خیرباد کہا اور نجیب آباد کی طرف چلے گئے۔ وہاں نواب محمود خاں کے ساتھ مل کر کئی مہینہ تک انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔

مسجد تک جہاں مولانا شیخ محمدؒ کا مکان تھا پہنچ گئی، لیکن قاضی عنایت علی نے نہایت بہادری سے اس کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب جلال آباد سے بھی آگے تک کیا پھر لوٹ آئے۔

جب تیسرا حملہ بھی پسپا ہو گیا تو انگریزوں نے جھلا کر بارہ ہزار اور ایک روایت کے بموجب چوبیس ہزار سپاہ اور توپ خانہ کے ساتھ چوتھی مرتبہ حملہ کیا مجاہدین اس کو نہ روک سکے اور میدان کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے جس کو جہاں موقع ملا چلا گیا۔ قصبہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔

سرسید نے اپنی تصنیف سرکشی ضلع بجنور میں لکھا ہے کہ:-
"پرتاب سنگھ کے گڑھ مکٹیشر چلے جانے کے بعد[1] جنرل محمود[2] خاں چودھریوں کی جانب سے مطمئن ہوگیا۔ گنگا پار کے جو باغی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا..... قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ گوجر اور حسن رضا عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میراں پور اتر آئے اور میراں پور کے تھانہ کو لوٹ لیا[3] اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور محمود خاں کے نام کی منادی پٹوائی اور پھر بھاگ آئے۔

---

[1] یہ واقعہ اوائل نومبر کا ہے۔

[2] سرکشی ضلع بجنور میں اس مجاہد کے نام کو ہر جگہ نا محمود لکھا گیا ہے۔ ہم نے اپنے قومی رہنما سرسید علیہ الرحمۃ کی روح پر فتوح سے معذرت کے ساتھ نا محمود کو محمود کر دیا ہے

[3] زمانہ کا انقلاب ہے کہ جن لوگوں کو ہمارے قومی رہنما اور مصلحین مفسد اور لٹیرے لکھ گئے ہیں ان ہی کو آج ہم مجاہدین اور محبان وطن کے معزز القاب سے یاد کر رہے ہیں ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اس کے بعد جب احمد اللہ خاں کو انتظام حکومت سپرد ہو گیا تو انہوں نے انگریزی افواج کے روکنے کے لئے مختلف مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں دارا نگر میں مارے خاں، قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ کو تعینات کیا گیا ان تینوں کے زیر کمان ۴۵۰۰ پیادہ اور ۶۹۸ سوار فوج تھی۔ یہ انتظامات ماہ مارچ ۱۸۵۸ء میں کئے گئے تھے۔

انگریزی افواج مختلف مورچوں پر لڑتی اور ان کو سر کرتی نجیب آباد میں داخل ہو گئیں۔ مارے خاں خبر پاتے ہی دارا نگر سے مع اپنی افواج نگینہ آگیا اور نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے اور احمد اللہ خاں کو بلانے کے لئے سوار بھیجے اور جتنی فوج کہ متفرق ہو گئی تھی اور جتنے باغی فرار ہو گئے تھے سب کو بلا کر جمع کیا۔ چنانچہ سب باغی یعنی مارے خاں، قاضی عنایت علی، دلیل سنگھ گوجر، احمد اللہ خاں، شفیع اللہ خاں، حبیب اللہ خاں، کلن خاں اور نتھو خاں متعین افضل گڑھ کل اپنی جمعیت اور توپوں کو لے کر بمقام نگینہ جمع ہو گئے۔ مگر محمود خاں نگینہ نہیں آیا بلکہ سیوہارہ میں جا کر مع ایک ضرب توپ اور کچھ سواروں کے مقیم تھا۔

نگینہ کی لڑائی ۱۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ مجاہدین پسپا ہو کر شہزادہ فیروز کے پاس مراد آباد چلے گئے۔

قاضی عنایت علی بھی شہزادہ فیروز کی فوج میں شامل ہوئے یا نہیں اس کا حال "سرکشی ضلع بجنور" سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ زبانی روایتوں سے پتہ چلا ہے کہ وہ شہزادہ کے ساتھ رہ کر بھی کچھ عرصہ تک انگریزوں کا مقابلہ

کرتے رہے، لیکن جب شہزادہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا تو قاضی صاحب مایوس ہو کر بھوپال کی طرف، جہاں ان کے بعض اعزا پہلے روانہ ہو گئے، بھوپال پہنچ کر نواب سکندر جہاں[1] بیگم کی ملازمت میں منسلک ہو گئے، تقریباً چھ ماہ رہنے پاتے تھے کہ وہاں کے پولیٹیکل افسر کو ان کی موجودگی کا علم ہو گیا اس لئے وہ بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

بھوپال سے چل کر آگرہ آئے۔ اس زمانہ میں ہائی کورٹ آگرہ میں تھی وہ نام بدل کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں عوام اور حکام پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا، لیکن بد قسمتی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک سال بعد جج کو معلوم ہو گیا کہ یہ تھانہ بھون کے قاضی عنایت علی خاں ہیں۔ وہ بھلا آدمی تھا اور قاضی صاحب کی قابلیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا اس لئے اس نے ان کو پہلے ہی خطرہ سے آگاہ کر دیا اور رائے دی کہ:

"آگرہ سے کسی اور جگہ چلے جاؤ۔"

انہوں نے الور کا رخ کیا، راستہ میں مرض ضیق النفس لاحق ہو گیا، تاہم وہ الور پہنچ کر مہاراجہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ سنا ہے کہ مہاراجہ الور نے

---

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی میں حکمران بیگم کا نام قدسیہ بیگم تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں بھوپال کی مسند پر سکندر جہاں بیگم رونق افروز تھیں، ان کا عہد ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ تا ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء ۱۲۸۵ھ ہے۔

انہیں اپنا محافظ خاص مقرر کر لیا تھا۔

الور ہی کے دوران قیام میں ایک مرتبہ پوشیدہ طور پر تھانہ بھون آئے اور تین روز قیام کر کے واپس چلے گئے، الور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون[1] ہیں۔ انتقال کے موقع پر مولانا شیخ محمدؒ کے بہنوئی حکیم شیخ احمد ریاست میں حاکم ضلع تھے، انہوں نے خفیہ طور پر تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ رات ہی میں چند آدمیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور تاریکی شب میں دفنانے کے لئے لے چلے۔ اتفاق سے قبر مکمل ہونے میں دیر ہو گئی، اسی میں دن نکل آیا مسلمان سپاہیوں پر مشتمل کئی فوجی دستے ادھر سے گذرے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر کچھ میواتی آئے انہوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور قبر تیار ہونے پر جسد خاکی کو آسودۂ خاک کر دیا گیا، غرض جس شخص کی زندگی زیادہ تر ناکامیوں سے دوچار رہی تھی اس کا یہ شاندار انجام ہوا۔

روپوشی کا زمانہ

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے اس جہاد میں کس قدر حصہ لیا اس کے متعلق نہ کوئی زبانی روایت ملی اور نہ تحریری شہادت[2] تاہم قصبہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا تو اوروں کے ساتھ آپ کو بھی

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی میں ان کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء تحریر ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا

[2] نسیم احمد فریدی امروہی، حکیم محمد عمر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے معرکہ شاملی میں حصہ نہیں لیا، اس تحریر سے بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب انگریزوں کے حملے تھانہ بھون پر ہوئے اس وقت آپ مدافعین کے ساتھ شریک رہے یا نہیں۔

نکلنا پڑا۔ رام پور منہاران میں آپ کے کچھ رشتہ دار تھے وہیں دو تین سال تک روپوشی کی زندگی گذارتے رہے، آپ کا قیام اس حویلی میں تھا جو محل کے نام سے مشہور ہے اور بقول آپ کے "وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا"

رام پور میں آپ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء تک مقیم رہے، وہاں سے کئی مرتبہ میرٹھ بھی جانا ہوا، لیکن غالباً گرفتاری کے ڈر سے ایک دفعہ بھی تھانہ بھون نہیں آئے، حضرت مولاناؒ نے تھانہ بھون سے جدائی کے ان ایام کو دورِ جلا وطنی سے تعبیر کیا ہے[1]۔ لیکن جلا وطنی اور روپوشی کا یہ زمانہ علمی مشاغل کے لئے نہایت سازگار رہا۔ ان ہی ایام میں آپ نے مثنوی معنوی دفتر ہفتم مکمل کیا، اور اسی زمانہ میں حزب البحر کی شرح لکھی۔ ایک اور تصنیف ارشاد محمدی بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کو آپ نے مولوی فدا علی اور منشی محراب علی ٹونکی کے ایما پر مرتب فرمایا۔

ٹونک میں قیام

۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں نواب وزیر الدولہ کے بلانے پر ریاست ٹونک تشریف لے گئے۔ اور وہاں نواب محمد علی کے جو اس وقت ولی عہد تھے استاد مقرر ہوئے۔

ٹونک میں حضرت مولاناؒ کئی سال مقیم رہے، آپ کے دوران قیام میں نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا، ان کی جگہ نواب محمد علی مسند نشین ہوئے۔

---

[1] حضرت مولانا نے اس امر کا اظہار ۱۲۷۷ھ میں شرح حزب البحر کی آخری سطور میں کیا ہے۔

جب تک آپ ٹونک میں مقیم رہے نواب وزیر الدولہ اور ان کے بعد نواب محمد علی نے آپ کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ مہمان رکھا، سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ قیام ٹونک کے دوران ایک دلچسپ اور عبرت آموز واقعہ پیش آیا جو جزئی اختلاف کے ساتھ کئی طرح بیان کیا جاتا ہے، سب سے زیادہ معتبر و مستند روایت یہ ہے۔

"ایک ہندو راجہ نواب صاحب ٹونک کا دوست تھا، وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتا رہتا تھا، مذہب اسلام کو اچھی طرح جانچنے کے بعد وہ اس کی حقانیت کا قائل تو ہو گیا لیکن ایک وسوسہ اس کے دل میں ایسا قائم ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے ہچکچاتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن مجید واقعی خدا کا کلام ہے تو اس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں پر ہونا چاہئے، لیکن مسلمان رات دن اس کا ورد کرتے ہیں پھر بھی ان پر رنج و خوشی اور وعید و نوید کی آیتوں کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس کو الہامی کتاب کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ نواب صاحب کے سامنے بھی اس نے اپنے اس وسوسہ کا اظہار کیا۔ نواب صاحب نے اس کو حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا اور اس راجہ سے جمعہ کے روز نہا دھو کر اور پاک و صاف

کپڑے پہن کر آنے کو کہا، آپ کے ارشاد کے بموجب وہ راجہ جمعہ کے دن حاضر خدمت ہوا، آپ نے اس کو سامنے بٹھا کر سورۂ "ق" کی تلاوت فرمائی جس کو سنکر وہ لوٹنے اور تڑپنے لگا، جب آپ تلاوت سے فارغ ہوئے تو وہ دوڑ کر آپ کے قدموں پر گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا، اس کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ:۔

قرآن مجید یقیناً کلام اللہ ہے، لیکن یہ ان ہی لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے جن میں تقویٰ و طہارت ہے، فی زمانا مسلمانوں کے قلوب دنیوی آلائش سے ایسے ملوث ہو گئے ہیں کہ نور ہدایت کی کرنیں ان میں نفوذ نہیں کر سکتیں"

ٹونک سے واپسی

حضرت مولانا شیخ محمدؒ ۱۲۸۲ھ کے آخر یا ۱۲۸۳ھ[1] کے شروع میں ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ ٹونک کے دوران قیام میں آپ کے پاس گورنمنٹ ہند نے محال باغیان نقبہ تھانہ بھون کے نیلام کا اشتہار بھیجا تھا۔ نیلام کی زد میں آپ کی اپنی جائیداد

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ ۱۲۸۰ھ میں ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے آئے تھے، لیکن اس سنہ کی صحت پر اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کے دو صاحبزادے ۱۲۸۲ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے تھے اور اس وقت آپ کا قیام وہیں تھا۔

بھی آگئی تھی۔

حضرت مولانا نے وطن واپس آکر گھیر کا وہ محل جس میں قاضی عنایت علی کا قیام تھا اور کچھ صحرائی جائداد انیس ہزار روپے میں خرید لی اور زرچہارم خزانہ میں داخل کر دیا، لیکن کلکٹر نے دوسرے دن قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ پوری جائداد ایک بنئے کو دیدی، آپ نے مقدمہ لڑا یا اس میں جیت گئے۔ روپیہ کی ادائگی میرٹھ کے ایک مہاجن سے قرض لے کر کی گئی پھر اس مہاجن کا قرضہ نواب محمود علی صاحب رئیس چھتاری سے قرض حسنہ لے کر اور جائداد کو ان کے پاس مکفول کر کے ادا کر دیا۔ لیکن نواب صاحب کے کارندوں کی سازشوں سے معاملات بگڑ گئے۔ انہوں نے فرشتہ صفت نواب کو کچھ غلط باتیں بتا کر حضرت مولانا سے بدظن کر دیا۔ نواب صاحب نے تین چوتھائی جائیداد نیلام کرا کر خود خرید لی۔ حضرت مولاناؒ نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، آخر کار نواب صاحب کی فطری نیکی غالب آئی، انہوں نے حضرت مولانا کو چھتاری بلا کر اپنی تقصیر کی معافی چاہی اور تمام جائداد واپس کر دی لیکن عدالتی کارروائی کی تکمیل حضرت مولانا کے وصال کے بعد ہوئی۔

اسی مقدمہ کے دوران دو مرتبہ آپ کو چھتاری جانا پڑا۔ دوسرے سفر میں آپ بیمار ہو گئے اور یہی بیماری مرض الوفات ثابت ہوئی۔

یہ مقدمہ حضرت مولانا کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں کی کسوٹی بن گیا، آپ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہے۔ نہ آپ نے روپے پیسے کی پروا کی نہ مال و املاک کے جانے کا غم کیا اور نہ خوشامد درآمد سے کبھی اپنا کام

نکالنے کی کوشش کی۔[1]

آخری ایام مرض الوفات اور وصال

حضرت مولاناؒ کے آخری ایام میں جائیداد کا قضیہ برابر چلتا رہا۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کے دیگر مشاغل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی درحقیقت مقدمہ میں آپ نے عملی طور پر بہت کم حصہ لیا۔ زیادہ تر کام آپ کے مریدین ہی نے انجام دیا۔ بعض اوقات تو آپ کو محض دستخط ہی کرنے پڑے باقی کارروائی مریدین نے خود ہی پوری کر دی، اس پر بھی کئی بار آپ نے فرمایا:۔

میاں! کہاں کا قصّہ ہے دور بھی کرو،

لیکن وہ خیر خواہ آخر وقت تک اس معاملہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے بہرکیف حضرت مولاناؒ تمام نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر تصنیف و تالیف ذکر و فکر اور مجاہدہ و مکاشفہ میں مشغول رہے۔ کئی مرتبہ مختلف مقامات کا سفر بھی کیا۔ نواب محمد علی والی ٹونک معذور کر کے بنارس بھیج دئے گئے تو وہاں ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، بارہا میرٹھ گئے۔ حیدرآباد سے بھی بعض معتقد علماء نے آپ کو بلایا لیکن اس لئے تشریف نہیں لے گئے کہ وہاں کے بعض علماء حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو برا کہتے تھے۔

آپ کی آخری دور کی تصنیفات "انوار محمدی" اور حاشیہ بر سنن نسائی ہیں، سب سے آخری تحریر ایک استفتا کا جواب تھا جو "سماع موتیٰ" کی تحقیق

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

کے بارے میں آپ نے حکیم محمد عمر سے لکھوا کر بھجوایا تھا۔

نسائی پر حاشیہ لکھنے سے پہلے ہی آپ کی طبیعت علیل ہو گئی تھی۔ رجب ۱۲۹۵ھ میں لرزہ اور بخار آنے لگا تھا، حکیم محمد عمر صاحب نے علاج کیا افاقہ ہو گیا مگر مرض کا پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اسی حالت میں آپ نے رمضان شریف میں قرآن شریف سنایا، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ آئندہ سال ماہ صیام تک حیات مفہوم نہیں۔ حکیم صاحب نے جب فرمایا:۔

"نہیں حضرت کمزوری ہے انشاء اللہ رفع ہو جائے گی"

تو آپ ہنس کر خاموش ہو گئے۔

طبیعت ذرا سنبھلی تو نہایت تیزی سے نسائی کا حاشیہ لکھا اور اسے بہت جلد مکمل کر دیا۔ پھر چہ تھاول ہوتے ہوئے چھتاری تشریف لے گئے وہیں مرض الوفات لاحق ہو گیا۔ خدام نے وہاں سے لاکر چار روز میرٹھ میں رکھا۔ اور علاج کیا۔ جب افاقہ نہ ہوا تو تھانہ بھون لے آئے۔ علاج ہوتا اور مرض بڑھتا رہا۔ آخر شب وہ وقت آن پہنچا جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں۔

۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۷۹ء بروز منگل فصری سنہ کے حساب سے ۶۶ سال اور شمسی سنہ کے مطابق ۶۴ سال کی عمر میں آپ نے دار فانی سے دار باقی کی جانب رحلت فرمائی۔ آخری لمحات کا نقشہ آپ کے مرید خاص حضرت مولانا فتح محمد تھانوی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

جناب مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح پرواز کرنے کے وقت یہ خاکسار بھی موجود تھا، عین حالت نزع اور رحلت فرمانے میں ذکر سلطان الاذکار اور پاس انفاس زبان مبارک پر جاری

معلوم ہوتا تھا، قریب نصف شب کے روح پر فتوح نے
اپنے مقام اصلی کی راہ لی اور اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی
انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون[1]،،

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں آپ کے مرض وفات اور وصال کی وہ تفصیلات بھی درج کر دی جائیں جو مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے حکیم محمد عمر چرتھاولی کے حوالہ سے بیان فرمائی ہیں :۔

وسط ربیع الاول میں آپ چھتاری تشریف لے گئے۔ راستہ میں چرتھاول میں بھی ایک رات قیام فرمایا۔ چرتھاول میں جب شرح نسائی کا ذکر آیا تو کچھ اس قسم کے کلمات حسرت آیات فرمائے کہ سامعین کے قلب و جگر پاش پاش ہو گئے صبح ہی وہاں سے چھتاری کے لئے سوار ہو کر روانہ ہوتے اور شام تک وہاں پہنچے۔

چونکہ حالت ضعف میں یہ طویل سفر کیا تھا۔ اس لئے تکان کے باعث رات کو بخار آگیا، نواب صاحب کے اصرار پر پانچ چھ روز وہاں رہنا ہوا، دوا اور پرہیز کچھ نہ تھا۔ وعظ بھی کہنا پڑا، بخار بدستور رہا، بلکہ بڑھتا رہا حتی کہ جب

---

[1] وفات کی شب ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد دہلی کا دایاں مینار گر گیا ہے، ایک اور بزرگ نے خواب ہی میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں پوچھا تو فرمایا کہ وہ مولوی شیخ محمد آنے والے ہیں ان کو لینے کے لئے تشریف لائے ہیں رسالہ عطاء المنان۔

آپ واپسی میں میرٹھ اترے تو طبیعت بہت ناساز ہوگئی، رات بھر نیند نہ آئی، صبح کو احباب کے کہنے سے دوا لی۔ دوپہر تک طبیعت کچھ اچھی رہی، پھر یکایک بخار بڑھ گیا اور ساتھ ہی ذات الجنب ہوگیا اس میں خشکی و تشنگی، سوء تنفس اور کھانسی کی زیادتی ہوگئی، بے ہوشی اور غفلت بھی رہنے لگی، تین چار روز شہر میرٹھ کے طبیبوں کا معالجہ کیا گیا، پھر حکیم عبدالغفور صاحب سکندرآبادی آگئے ان کا نسخہ دیا گیا۔ ۲۶ ربیع الاول کو سہ پہر کے وقت منشی غلام حسین ہاپوڑی کو بلاکر فرمایا کہ آج کی رات میرے پاس بیٹھے رہنا انشاء اللہ اس کے صلے میں تم کو کوئی نفع خاص پہنچے گا۔ چنانچہ بسر وچشم حاضر رہے، اس کے بعد آپ کو تھانہ بھون لے جایا گیا۔ طبیعت بدستور ناساز رہی، شب وفات سے پہلے جو پیر کا دن آیا تو آپ نے کچھ سنبھالا لیا۔ اسی دن مولانا محمد محمود صاحب جو ریاست ٹونک میں ناظر تھے حسب الطلب آگئے۔ حکیم محمد عمر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں محمود بخیر و عافیت آپہنچے، سنتے ہی فرمایا بس تو آج ہی تک کا قصہ تھا اتنے میں میاں محمود نے حاضر خدمت ہوکر سلام عرض کیا۔ حضرت نے حکیم صاحب سے فرمایا:۔

> اچھا فقیر کی چارپائی درست کرادو، اور خوب دیکھ بھال کر روبہ قبلہ بچھا دو، سب کو سمجھا دو کہ جہاں تک فقیر کا سامنا ہے ادھر سے کوئی شخص نہ آنے پائے اور اس وقت میری مجلس میں کسی ایسے شخص کی آمد و رفت نہ ہونے پائے جو مخالفِ ملتِ حضرتِ شفیعِ محشر ہو۔"

پھر فرمایا:۔

"دیکھو کھانا تیار ہو گیا ہو گا، جلد منگا لو اور تم اور محمود مع اور سب صاحبوں کے ایک جگہ بیٹھ کر کھا لو"

المختصر بارہ بجے دن سے پہلے پہلے یہ تمام انتظام فرما چکے تھے، سب مہمانوں نے کھانا کھا لیا، چونکہ سوائے دوا یا پانی کے سترہ اٹھارہ دن سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے، مگر پاس انفاس اس حالت میں بھی برابر جاری رہا، شروع زمانہ ذکر و شغل میں جاگتے، سوتے، سوار، پیادہ، ارادہ بلا ارادہ پاس انفاس جاری رہتا تھا، اسی شدت مرض کے زمانہ میں ایک دن فرمایا کہ "یہ فقیر اس کے ترک کی قدرت نہیں رکھتا، دم بھر کو بھی نہیں چھوڑ سکتا"۔ جب دن چڑھا، ایک دورہ پڑا جس سے تنفس بڑھ گیا، آپ نے آہستہ آہستہ کچھ پڑھا اور حکیم صاحب سے فرمایا:۔

دو مونڈھے منگا لو اور میری چارپائی سے جانب قبلہ اپنا مونڈھا اور جانب شرق محمود کا مونڈھا ڈالو اور دونوں جانب تم دونوں بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر میرا حال دیکھو"

تعمیل ارشاد کی گئی، اس کے بعد لمبے سانس کے ساتھ "اللہ" کہا اور آنکھیں بند کئے بیس منٹ تک بے حس و حرکت لیٹے رہے اور پھر آنکھیں کھول کر میاں محمود سے مخاطب ہو کر فرمایا "کچھ دیکھا؟" انہوں نے عرض کیا "شاید غلبہ کا اثر تھا" فرمایا "نہیں" بعدہٗ حکیم صاحب سے فرمایا "بھلا کیا بات تھی؟" انہوں نے عرض کیا "شاید حضرت کی توجہ خداوند قدوس کی جانب تھی" فرمایا "ہاں"

دن کے ایک بجے کا وقت تھا کہ سلطان الاذکار کے اندر مشغول ہو گئے، ہر سانس کی آمد و شد سے لفظ "اللہ" صاف صاف نکلنے لگا۔ شام کے وقت مجلس حضرت میں اہل شہر کا ایک کثیر مجمع ہو گیا۔ پاس انفاس اور سلطان الاذکار کی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ہر واقف و ناواقف پر بھی ظاہر ہو گئی، متولی عبدالرحمٰن تھانوی نے بصد نالہ و فغاں کہا:۔

"افسوس! آج یہ آفتاب عالمتاب چھپا چاہتا ہے"

بقول حکیم محمد عمر صاحب:۔ اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک میدان وسیع میں صدہا اولیاء اللہ اور ہزاروں صوفیائے باصفا جہر کے ساتھ ذکر اللہ کر رہے ہیں اور ہر طرف سے "اللہ اللہ" کی صدا آ رہی تھی"۔ ساڑھے گیارہ بجے رات تک یہ کیفیت رہی اور جب نصف شب گذر گئی دفعتہً مغرب کی سمت سے ایک آندھی اٹھی اور بادل چھا گیا۔ اسی وقت روح پرفتوح عالم بالا کی جانب رخصت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جیسے ہی حضرت نے انتقال فرمایا پہلے تو سخت زلزلہ آیا۔ پھر دیر تک بادلوں کا شور اور آندھی کا زور رہا۔ آپ کی وفات کی وجہ سے جہاں زمین لرزاں تھی اور آسماں گریاں وہاں تمام حاضرین کے دل و جگر بریاں تھے، بہت سے لوگوں نے رات ہی سے قرآن مجید اور کلمہ توحید بطور ایصال ثواب پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بہت سے ناظرہ خواں اور حافظ قرآن جمع ہو گئے اور سب تجہیز و تکفین، قرآن کی تلاوت اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دن دس بجے کے قریب عید گاہ کے نزدیک نماز جنازہ پڑھی

گئی، شہر کے مسلمانوں کے علاوہ دور دور کے لوگ شریک جنازہ ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت تک ریل اس علاقہ میں جاری نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود ایک بڑا مجمع پیدل اور سواری سے شرکت جنازہ کے لئے تھانہ بھون پہنچ گیا تھا۔ اتفاقاً گورکنوں کی غلطی سے قبر کی تیاری میں دو گھنٹہ کی دیر ہو گئی اس عرصہ میں آپ کے خلیفہ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوری بھی آ گئے غرض دوپہر سے پہلے سپہر علم و عرفان کا یہ آفتاب نیمروز زیر زمین غروب ہو گیا[1]

تاریخ وفات کا ایک مادہ آیۃ کریمہ :-

عسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

اور دوسرا وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ کا لفظ "غَيْرَ بَعِيْدٍ" ہے۔ ان کے علاوہ کئی مادے حکیم محمد عمر چوتھاولی نے نکالے تھے

(۱) کیا قطب ارشاد نے انتقال آہ (۱۲۹۶ھ)

(۲) اے عمر فکرِ سنِ رحلتِ مغفور رہے گر — کر شمارِ عدد شیخ محمد مرحوم
۱۲ ۹۶ھ

(۳) رنج و الم شد چرا جان و جگر چوں فشرد — عارف انہ ہستی بگو شیخ محمد نمرد
۱۲ ۹۶ھ

یہ تاریخ بھی حکیم صاحب نے کہی تھی :-

دیدۂ صوری سے دیکھو معنوی سے خواہ عمر — چھ عدد بارہ سو نوّے پڑھے تھے آہ کے

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء

چند اور حضرات کے مادّے بھی قابل غور ہیں :-

(۱) ہائے افسوس چراغ گل ہوگیا (۱۲۹۶ھ)

(۲) قطب ارشاد رفت (۱۲۹۶ھ)

(۳) ھو غفر لہ (۱۲۹۶ھ)

انتقال کے وقت ایک عجیب واقعہ

جس روز رات کو تھانہ بھون میں آپ کا وصال ہوا اسی دن ریاست جھالاوار میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔

"کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے، دیکھتے کیا ہیں کہ بے شمار آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے نہایت تیزی سے کسی طرف جا رہے ہیں، کھیت میں کام کرنے والے ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ "اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو؟" ان میں سے ایک نے جواب دیا "تمہیں معلوم نہیں، تھانہ بھون میں حضرت مولانا شیخ محمد کا انتقال ہوگیا ہے ہم ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں"۔

تھوڑی دیر میں وہ مجمع آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، لیکن صبح کو دیکھا گیا کہ بہت سی مشعلیں بجھی ہوئی کھیتوں میں بکھری پڑی ہیں"۔

اس راز کو نہ اس وقت کوئی سمجھ سکا تھا اور نہ یہ معمہ اب سمجھنے یا سمجھانے کا ہے بزرگوں کی باتوں اور ان کی کرامتوں کو بزرگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کے مزار کی حالت

حضرت مولاناؒ کا مزار پر انوار تھانہ بھون میں شاہ ولایت صاحب کے مزار کے قریب واقع ہے قبر کا تعویذ کچا ہے، البتہ قبر کے چاروں طرف اینٹوں اور گچ کا چبوترہ بنا کر اس کو محفوظ کر دیا گیا ہے، بالیں پر کوئی کتبہ نصب نہیں، اس لئے جب تک کوئی بتانے والا نہ ہو مزار کا پتہ چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

علم و فضل اور شمائل و خصائل

حضرت مولانا شیخ محمدؒ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں علم متوارث تھا، غالباً قانون توارث کو پیش نظر رکھ کر بعض حضرات آپ کے شوق علمی کو جدی میراث کہہ دیں گے، لیکن جب یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ کئی پشتوں تک اس خاندان میں حضرت مولانا جیسا دوسرا عالم نظر نہیں آتا تو پھر لا محالہ یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ آپ کو قدرت نے غیر معمولی طور پر فہم و ذکا اور ذہانت و فطانت سے سرفراز فرمایا تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر کی یہ رائے اپنی جگہ صحیح ہے:۔ وکان مفرط الذکا، سریع الادراک، قوی الحفظ حلو الکلام حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو علم و حکمت کے لئے بے پایاں صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ آپ کی زندگی میں وہی شان نظر آتی ہے جو دیگر علماء اور اکابر کی زندگیوں میں دکھائی دیتی ہے، جو چیزیں عام آدمی سالہا سال کی محنت شاقہ کے باوجود نہیں سمجھ سکتے ان کو آپ کا ذہن نہایت جلد اخذ کر لیتا تھا، پھر آپ کو کسی ایک علم سے ہی مناسبت نہیں تھی بلکہ جملہ علوم معقولات

ومنقولات میں تبحر حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ نہایت زود نویس اور خوش قلم بھی تھے۔ حضرت مولانا فتح محمد تھانوی کی تحریر سے آپ کی علمی قابلیت کا ایک واضح خاکہ ہماری نگاہ تصور کے سامنے آجاتا ہے۔

"اور علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہونا ایسا نہیں کہ محتاج بیان ہو، مشتے نمونہ از خروارے عرض کرتا ہوں۔ حافظ کلام اللہ، محدث صوفی صافی، علم حدیث میں مہارت تامہ اور علم تفسیر میں وہ ملکہ کہ کشاف اور بیضاوی اور عالم ہمہ لبریز از برکتی اور لغت دانی کا یہ حال کہ اگر حافظ قاموس اور صُراح اور مجمع البحار کہا جائے تو عجب نہیں اور خود محقق ایسے ہوئے کہ جس لغت کے درپے ہوں سہندی کی چندی کی نوبت پہنچادیں اور علم فقہ میں وہ کمال کہ علاوہ اصول کے فروعات اور جزئیات پر نظر کہ سائل کے دل کی تشفی ہوجائے اور علم الکلام میں ید طولیٰ، علم و معانی اور بیان کا کیا بیان علم ادب میں کچھ کہا نہیں جاتا۔"

غرض علم سے فطری لگاؤ تھا، تمام عمر علمی مشاغل جاری رہے، علماء کی صف میں ہمیشہ ممتاز سمجھے جاتے رہے اور ہر زمانہ کے اکابر نے آپ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا۔

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم باطنی کی طرف بھی آپ کا رجحان اوائل عمر ہی سے تھا، چنانچہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بعمر سات سال بیعت

کی، پھر جب حضرت میاںجیو نور محمدؒ کی بزرگی کا نقش دل پر جم گیا تو ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے میں تامل نہیں کیا، حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، اس ذاتی شوق و ولولہ اور تڑپ کے ساتھ بزرگوں کی نظر فیض اثر نے مل کر آپ کو بہت جلد علم باطنی کے بھی اعلیٰ مدارج پر فائز کر دیا اور آپ کے مرشدوں نے آپ کے علوئے مراتب کی تصدیق کی۔ ایک طرف حضرت میاںجیو نور محمدؒ کا آپ کے متعلق یہ ارشاد :-

"یہ معارف ربّانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے"

اور دوسری جانب حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب کا یہ فرما دینا :-

"تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے اور تمہیں اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں"

دو ایسی وقیع شہادتیں ہیں کہ ان کے بعد آپ کی تحصیل و تکمیل باطنی کے لئے مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دونوں قسم کے علوم کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی عملی زندگی شریعت و طریقت کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ تھی، بعض نام نہاد صوفیوں کی طرح آپ نے کبھی شریعت کو حقیر نہیں سمجھا بلکہ طریقت کے لئے شریعت کو ضروری قرار دیتے رہے، شریعت کا احترام جیسا اور بزرگان دین کو ملحوظ تھا ویسا ہی حضرت مولانا کے دل میں بھی عمر بھر قائم

رہا، سلوک کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہونے کے باوجود آپ نے عبادات کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ بلکہ اس معاملہ میں اتنا اہتمام رکھا کہ نہ صرف اپنا تہجد کبھی قضا نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے مریدین کو بھی سختی سے اس کی تاکید فرماتے رہے۔ نسیم احمد صاحب علوی جھنجھانوی نے "نور محمدی" میں حضرت میانجیو نور محمدؒ کے وصال کا ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ایک طرف حضرت میانجیوؒ کی کرامات کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے تقویٰ و تقدس پر روشنی پڑتی ہے لکھتے ہیں

> پیر جی محمد صادق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ سے بیعت ہونے کے بعد بارہ سال تک حضرت کے بتلائے ہوئے اوراد وغیرہ پر پابندی کرتے رہے، بارہ سال کے بعد ایک روز نماز تہجد قضا ہوگئی، صبح کو اس کا تذکرہ حضرت مولانا صاحب سے کیا، آپ کو نماز تہجد کا قضا کرنا بہت ناگوار گزرا اور حکم دیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ہمارے یہاں تمہارا کام نہیں چلے گا۔ آپ حسب الحکم پیر و مرشد گھر آگئے اور دل میں طے کرلیا کہ اپنے بڑوں کے یہاں یعنی حضرت میانجیوؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوں۔ خرچ کے لئے زاد راہ جو دیکھا، دو پیسے نکلے، ان میں سے ایک پیسہ کا ستو اور ایک پیسہ کی شکر لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت کے مزار پر پہنچکر اس ستو کو پانچ وقت کیا۔ چھٹے وقت کھانے کیلئے

کچھ پاس نہ رہا، آپ حضرت کے مزار مبارک سے لپٹ کر بہت روئے، شب میں حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا، فرما رہے ہیں:۔

محمد صادق! لے اپنے دو پیسے جو تیرے خرچ ہوئے ہیں"

آنکھ کھلی تو ہاتھ میں دو پیسے تھے۔ صبح کو میں حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کی مسجد میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر یہ آواز دی:۔

مسجد میں کوئی محمد صادق صاحب ہیں؟"

میں پہنچا، وہ آنے والے ایک خوان میں کھانا لئے ہوئے تھے جو گرم تھا، فرمایا کہ رات خواب میں چچا صاحب نے فرمایا کہ:۔

"ہمارے یہاں مہمان تین روز سے آئے ہوئے ہیں، ان کے دو پیسے جو خرچ ہوئے تھے وہ تو ہم نے ان کو دیدئے ہیں، لیکن وہ رات سے بھوکے ہیں، ان کو کھانا کھلاؤ، میں کھانا کھا کر نماز چاشت پڑھ کر فارغ نہیں ہوا تھا کہ گاڑی کے رنگولے کی آواز آئی کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تشریف لے آئے ہیں اور فرمایا "محمد صادق! ہمارے ساتھ چلو، رات حضرت میاں جیوؒ نے خواب میں فرمایا ہے تم اس کو لے آؤ، ہمارے یہاں سختی نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل و کرم پہ بھروسہ ہے"

(بروایت قاضی ظفر احمد صاحب قاضی شہر سہارنپور)

غرض اتباع شریعت کا اس قدر خیال تھا کہ اس میں غیر معمولی سختی تک کو روا رکھتے تھے، لیکن عام طور پہ آپ کے رویہ میں بہت نرمی تھی، شریعت و طریقت

کے امتزاج نے مزاج میں حسن اعتدال پیدا کر دیا تھا، آپ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ جو شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحہ کو بھی آپ سے جدا ہو، کلام میں ایسی شیرینی تھی کہ جو سنتا تھا اس کی طبیعت نہیں بھرتی تھی، یہی چاہتا تھا کہ گفتگو میں اور بسط و شرح ہو[1]، باتیں سادہ اور عام فہم زبان میں کرتے تھے، البتہ وعظ کہتے وقت مشکل الفاظ اور دقیق اصطلاحیں استعمال کر جاتے تھے، لیکن ان کی تشریح یعنی سے کرتے جاتے تھے[2]۔

حضرت مولانا فتح محمد تھانوی آپ کے شمائل و خصائل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

"باوجودیکہ سن شریف ساٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا، مگر رونق چہرہ اور جمال صورت میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ اور خوش آوازی تو غضب ہی تھی، کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ کو جس لہجہ اور ادا سے پڑھتے تھے ذوق اس کا سننے والے ہی جانتے تھے اور خوش تقریری اور وعظ گوئی اور اس کی تاثیر کی وہ کیفیت

---

[1] ترجمہ شرح حزب البحر [2] آپ کے متعلق ارواح ثلثہ میں ایک حکایت اس طرح درج ہے:- حکایت (۳، ۲) فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب وعظ میں لغات بہت بولتے تھے اور اس کی تفسیر یعنی سے کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا میرٹھ تشریف لے گئے تو ایک شخص کی نسبت دریافت کیا کہ یہ کتابیہ میرٹھ سے ہیں یا اجابیش میرٹھ سے ہیں؟

دیکھی میں نے کہ ہر طرف سے آواز آہ و نالہ کی آتی تھی، اور ہاو ہو کا غل مچ جاتا تھا، تصوف اور سلوک میں وہ دسترس کہ بیان نہیں ہو سکتی، توجہ کی وہ تاثیر جو سامنے بیٹھا ادنیٰ اشارہ میں لوٹنا اور نعرہ مارنا یا سر پٹینا شروع کیا۔"

مولانا نصر اللہ خورجوی حضرت میاں جیو نور محمدؒ کے تینوں خلفاء کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

حالات سہ کس بزرگ در یاران ایشان (میاں جیو نور محمد) حاجی امداد اللہ صاحب، حاجی مولوی شیخ محمد صاحب و حافظ غلام[1] ضامن بالسنبت و با مذاق فقیر مہتند، و عالم بہ صحبت ایشاں رسیدہ بہ ذوق درویشی می رسد۔ صحبت این بزرگواران حکم اکسیر دارد۔

رباعی:۔

آہن کہ بہ پارہ آشنا شد ؛ فی الحال بہ صورت طلا شد
خورشید نظر چو کرد بر سنگ ؛ تحقیق کہ لال بے بہا شد

عجب مجمع این عزیزان در تھانہ است، خداوند تعالیٰ باقی دارد و جہانی را بہ فیضانِ محمدی از سینہ ایشان برساند۔"

اور بھی بہت سے علماء اور اکابر نے حضرت مولاناؒ کی بزرگی و برتری کا اعتراف کیا ہے

---

[1] صحیح نام حافظ محمد ضامن علی شاہ ہے۔

چنانچہ حضرت سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:۔

"ہمارے اکابر حضرات میں حضرت مولانا شیخ محمد صاحب بڑے بلند پایہ بزرگ ہوئے ہیں"

ازواج و اولاد

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے چھ شادیاں کیں[1]۔ پہلی شادی حضرت میانجیوؒ کے وصال سے پہلے ۱۲۵۲ھ میں ہو چکی تھی، اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ حضرت کے اس قول سے ہوتا ہے:۔

تم مجرد تھے اور حافظ صاحب و شیخ محمد صاحب عیالدار"

آپ کی دوسری شادی ۱۲۷۲ھ میں بی حمیدہؒ سے ہوئی۔ بی عائشہ بنت قاضی سعادت علی اور بی فاطمہ ۱۲۷۷ھ میں بی حمیدہؒ کے انتقال کے بعد ایک ساتھ آپ کے حبالہ عقد میں آئیں، موخر الذکر قاضی محبوب علی کی بھانجی اور نابینا تھیں، آخر میں دو اور بیوہ عورتوں سے شادی کی۔ اولاد صرف تین بیویوں سے ہوئی۔ بی حمیدہؒ، بی عائشہ اور بی فاطمہ سے۔

بی حمیدہؒ ۱۲۷۷ھ تک زندہ رہیں، ان کے ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی تھیں، صاحبزادہ کا نام محمد محمود تھا، وہ حضرت مولانا شیخ محمد کے خلف اکبر تھے اور ان ہی کی نسبت سے آپ کی کنیت ابو محمود ہوئی۔ ۱۵ شوال ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۹ مئی

---

[1] جن عورتوں کو آپ اپنے حبالۂ عقد میں لائے ان میں چار بیوہ اور ایک نابینا تھیں گویا اس معاملہ میں بھی آپ نے رسول صلعم کی پیروی کا خیال رکھا یہ تھا آپ کا اتباع سنت۔

کو پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق جولائی ۱۹۳۶ء میں تھانہ بھون میں فوت ہوئے۔ ان کی پہلی شادی حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین صاحبزادے محمد اعلیٰ، محمد افضل اور محمد مسعود اور ایک صاحبزادی امۃ الفضل پیدا ہوئیں۔ امۃ الفضل قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری سے منسوب تھیں، مولوی محمد محمود صاحب مرحوم کی تیسری بیوی پانی پت کی ایک نیک اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ آشوب ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچکر فوت ہوئیں ان کے ایک صاحبزادی امۃ الرحیم اور ایک صاحبزادے محمد احمد ہیں، دونوں پاکستان میں موجود ہیں۔

بی حمیدہؒ کی صاحبزادی مقصود النساء تھیں وہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ مطابق ۸ نومبر ۱۸۵۹ء کو قصبہ رامپور منہاران میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی مطبع مجتبائی کے موسس و مالک مولوی عبدالاحد مرحوم سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے عزیز اور احمد اور پانچ صاحبزادیاں حمیدہ، رشیدہ، صغریٰ امۃ الرحمٰن اور محمودہ تھیں، اول الذکر صاحبزادی خان بہادر محمد سلیمان سابق چیف انجینیر سے منسوب ہیں، اور اس وقت لاہور میں مقیم ہیں، صغریٰ اور امۃ الرحمٰن یکے بعد دیگرے محمد افضل ابن مولوی محمد محمود بن حضرت شیخ محمد سے منسوب ہوئیں اور محمودہ کی شادی محمد اعلیٰ خلف مولوی محمد محمود سے ہوئی تھی۔

بی عائشہ کے صاحبزادے مولانا محمد عمر صاحب تھے، ان کی ولادت ۲۲ شوال المکرم ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء بروز شنبہ بلدۂ دار الاسلام محمد آباد عرف ٹونک میں ہوئی

وہ اپنے بزرگ باپ کے صحیح جانشین تھے، انہوں نے بعض کتابیں حضرت مولانا فتح محمد سے پڑھی تھیں، بعدہٗ علوم متداولہ کی تکمیل دہلی جاکر کی۔ قاضی اسمٰعیل منگلوری (ف ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء) سے خرقہ خلافت حاصل کیا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور حیات مستعار کی محض ۳۷ بہاریں دیکھ کر ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں واصل رحمت حق ہوئے۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں دوسری اہلیہ مسماۃ مبارک النساء اور چاروں صاحبزادیاں امت المنان[1]، امت الرحمٰن[2]، امت الرحیم اور امت الکریم کراچی اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد عمر مرحوم کی حقیقی ہمشیرہ میمونۃ النساء تھیں وہ یکم شوال ۱۲۸۰ھ / ۱۰ مارچ ۱۸۶۴ء کو بلدہ دارالاسلام ٹونک میں پیدا ہوئیں اور ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء کو میں تھانہ بھون میں فوت ہوگئیں۔ ان کی نسبت قاضی عنایت علی کے صاحبزادہ مومن سے ہوئی تھی، لیکن کمخوابی سے پہلے دونوں فوت ہوگئے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی تیسری اہلیہ بی فاطمہ کے صرف ایک صاحبزادے محمد صدیق تھے، وہ بھی بلدۂ دارالاسلام ٹونک میں ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور بعمر ۲۸ سال ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں بمقام تھانہ بھون فوت ہوگئے ان کی شادی متولی محمد اسمٰعیل کاندھلوی کی دختر امہ ہانی سے ہوئی تھی جن سے صرف ایک صاحبزادی امہ کلثوم پیدا ہوئیں، وہ متولی ریاض الاسلام صاحب رئیس کاندھلہ سے منسوب ہیں اور کاندھلہ ہی میں مقیم ہیں۔

---

[1] راقم کی والدہ [2] اہلیہ قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی

مولانا محمد عمر مرحوم اور محمد صدیق مرحوم دونوں کی قبریں ریلوے اسٹیشن ٹھانہ بھون کے راستہ میں ایک چبوترہ پر واقع ہیں، نزدیک ہی ایک تاریخی کنواں ہے جو بائیس والے کے کنوئیں کے نام سے شہرت پذیر ہے، اس سے کسی قدر ہٹ کر عید گاہ ہے جو ہنوز اچھی حالت میں ہے۔

تلامذہ حضرت مولانا کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے لیکن محض تین حضرات کے اسماء گرامی معلوم ہوئے:۔

۱۔ قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہری جو ریاست بھوپال میں عہدۂ قضا پر فائز رہے۔

۲۔ نواب محمد علی خاں والئی ٹونک جو ۱۸۶۴ء میں مسند نشین ہوئے اور ۱۸۶۸ء میں معزول کر کے بنارس بھیجدئے گئے۔

۳۔ دیوان شمس الدین نائب وزیر ٹونک[1]

مریدین و خلفاء حضرت مولانا شیخ محمد کے مریدین کی تعداد بہت تھی، لیکن ان میں سے چار بہت اہم ہیں:۔

۱۔ قاضی محمد اسمٰعیل منگلوری (ف ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ) مولانا کے اجل خلیفہ تھے۔ صاحب باطن بزرگ اور قاضی عبدالغنی منگلوریؒ کے والد تھے قاضی عبدالغنی کا نام اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے مرشد کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہے کہ مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ خود قاضی اسمٰعیل صاحب

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

نے اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر بے انتہا شہرت پائی، انہوں نے ۱۳۰۸ھ میں ایک رسالہ "نور محمدی" بطور سوال و جواب حضرت ابو طالب محمد بن علی عطیۃ الیمنی المکی کی کتاب سے مسائل کا استخراج کر کے لکھا۔

۲۔ مولانا شیخ محمد تھانوی: قصبہ تھانہ بھون کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن کی نسبت سے اس قصبہ کو ذاتی شہرت نصیب ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں سے بہرہ وافی رکھتے تھے، صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ مولانا محمد عمرؒ خلف الرشید حضرت مولانا شیخ محمدؒ تھانوی نے بعض کتابیں انہی سے پڑھی تھیں، انہوں نے اپنے پیر طریقت حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی مرتبہ شرح حزب البحر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

۳۔ حکیم محمد عمرؒ تھانوی بھی بزرگ اور ذی علم شخص تھے، انہوں نے حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے حالات زندگی "نثر حالات محمدی" کے نام سے مرتب کئے تھے لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے، دوسرا اہم کام جو حکیم صاحب نے کیا تھا وہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی تصنیف مثنوی معنوی دفتر ہفتم کی ترتیب و اشاعت کا کام تھا، جس کو انہوں نے ۱۳۰۸ھ میں محبوب المطابع میرٹھ میں طبع کرا کر شائع کیا۔

۴۔ حاجی محمد صادقؒ تھانوی جن کا ایک واقعہ قاضی ظفر احمد صاحب کے حوالے سے کہیں اور درج کیا جا چکا ہے، حضرت مولانا کے ان مریدین میں سے تھے جن میں پیر سے والہانہ شیفتگی ہوتی ہے، گو علوم ظاہری میں ان کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا لیکن علم باطنی میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

تصنیفات

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزرا، پھر آپ کی قوت تحریر بھی بے پناہ تھی، دنوں اور ہفتوں میں نہایت دقیق موضوعات پر کتابیں تیار کر دیتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت تھی اس قیاس کو مولانا فتح محمد تھانوی کے اس فقرے سے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے "حضرت کی تصانیف سے ہر قسم کی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں بہت ہیں"[1] بعض کتابوں کے محض حوالے ملتے ہیں، مگر وہ کتابیں مفقود ہیں، بعض کتابیں ایسی ہیں جو حضرت مولاناؒ نے تصنیف فرمائیں، لیکن زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ انہی کتابوں میں سے ایک رسالہ "تنقیہ الاعتقاد و تصفیۃ الفواد من الکفر و الارتداد" ہے، جس کا حوالہ حضرت میاں جی نور محمدؒ نے اپنے مکتوب گرامی میں دیا ہے،

متعدد کتابوں کے نام نزہت الخواطر میں درج ہیں، مگر ان میں سے محض چند نظر آتی ہیں۔ باقی مفقود و معدوم ہو چکی ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) دلائل الاذکار فی اثبات البحر بالاسرار (۲) القسطاس فی اثر ابن عباس۔ (۳) المکاتبت المحمدیہ فی اثبات الذکر والجہر (۴) المناظرۃ المحمدیہ، وہ کتابیں ہیں جن کے اب محض نام باقی رہ گئے ہیں۔

---

[1] حکیم محمد عمر چریکوٹی نے حضرت مولانا کی تصانیف کی مجموعی تعداد بتیس ۳۲ بتائی ہے جن میں سے نصف سے کم زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

اس وقت حضرت مولانا کی محض سات تصنیفات مطبوعہ یا مخطوطہ کی شکل میں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔

(۱) حاشیہ بر سنن نسائی (۲) مثنوی معنوی دفتر ہفتم (۳) شرح حزب البحر (۴) ارشاد محمدی (۵) انوار محمدی (۶) بیاض محمدی (۷) رسالہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود والشہود۔

حضرت مولانا کی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔ اکثر کتابیں نثر میں ہیں، لیکن بعض نظم میں بھی تحریر فرمائی تھیں جن میں سے مثنوی معنوی دفتر ہفتم اس وقت موجود ہے، کتابوں کے موضوعات عموماً شرعی مسائل احادیث و تفسیر اور مسائل تصوف ہیں۔ چونکہ بحثیں عموماً عالمانہ ہیں اس لئے عبارت میں بھی جا بجا عربی کے ثقیل الفاظ اور دقیق مصطلحات استعمال ہوئی ہیں۔ نظم نسبتاً صاف اور رواں ہے، اردو عبارت پرانے انداز کی ہے اور موجودہ محاورہ کے مطابق نہیں، فارسی اور عربی الفاظ کا غلبہ ہے اکثر مواقع پر حضرت مولاناؒ خود بھی اس بات کا احساس کر کے کہ بعض مشکل الفاظ استعمال ہو گئے ہیں۔ آسان لفظوں میں اس کی تشریح کرتے جاتے ہیں مثلاً ارشاد محمدی کی تمہید میں فرماتے ہیں:۔

> ..... ان کی اتباع سنت ظاہری اور باطنی کا یعنی سیرت اور سریرت کا شوق دل میں لگایا۔ تا تکمیل ظاہری یعنی اصلاح اعمال اور تکمیل باطنی یعنی تہذیب اخلاق بکمال شوق و اطمینان ..... حاصل ہو ..... ہم نمک حرام نہ ہوں اپنے

منعم حقیقی اور مجازی کے یعنی خدا اور رسول کے بلکہ نمک حلال ہوں یعنی موحد اور متبع سنت ......"

یہی طرز بعض اوقات فارسی عبارتوں میں بھی جھلکنے لگتا ہے، لیکن اس کے نمونے بہت کم ہیں۔

حضرت مولانا کی جو چھ سات تصانیف دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں وہ بھی فی زمانہ نا کیاب ہیں۔ اس لئے ان پر انفرادی طور سے کچھ لکھنا بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ حاشیہ بر سنن نسائی، عربی میں ہے اور اس کی وجہ سے حضرت مولانا طبقہ علماء میں متعارف ہیں۔ ۱۲۹۵ھ میں جب آپ کو علالت سے کسی قدر افاقہ ہوا تو آپ نے نسائی پر حاشیہ لکھنا شروع کیا، جب آپ اس کی تحریر میں مشغول تھے تو آپ کا معمول یہ رہتا تھا کہ اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد لکھنے بیٹھ جاتے دوپہر تک لکھتے رہتے، نماز ظہر کے بعد پھر اس کام میں لگ جاتے، کتابیں بہت کم دیکھتے صرف قوت حافظہ سے کام چلاتے تھے۔ غرض بہت جلد اس کام کو مکمل کیا۔

سنن نسائی پر حاشیہ دوبار چھپا، دوسری مرتبہ ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوا۔ اس میں کہیں کہیں اسماء الرجال کے اور کہیں کہیں حدیث کی شرح کے سلسلہ میں فوائد درج ہیں۔

۲۔ مثنوی معنوی دفتر ہفتم[۱]۔ اس مثنوی کے پانچ مکمل دفتر اور چھٹے دفتر کا

---

[۱] مثنوی معنوی دفتر ہفتم کے متعلق مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی رقمطراز ہیں: ۹۶

کچھ حصہ حضرت مولانا جلال الدین رومی نے لکھا تھا وہ چھٹے دفتر کو اتمام کو نہ پہنچا سکے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ ان کی رحلت کے وقت ان کے فرزند نے باحسرت و یاس کہا:۔

"ابّا جان! آپ کا یہ کام نامکمل رہا جارہا ہے"

حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا:۔

"اس کی تکمیل وہ کرے گا جس کا یہ حصّہ ہے۔ زبانم مانند قلم کاست"

عارف رومیؒ کی یہ پیشین گوئی کئی سو سال بعد پوری ہوئی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو خواب میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفتر کو مکمل کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ حضرت مفتی الٰہی بخش نے اس کا تکملہ کیا اور فوت ہو گئے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

یا الٰہی بخش الٰہی بخش را ؛ از جلالش بود ذکر در ورا
دفتر سادس مکمل کرد و رفت ؛ عقدۂ کان بود ہم حل کرد و رفت

---

۴۴ یہ مثنوی اعلیٰ اور معیاری فارسی میں ہے، درحقیقت یہ مثنوی آپ کے ذوق شعری کی آئینہ دار اور آپ کی فارسی انشاء کا شاہکار ہے، سوز و گداز، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے"

اس اعتراف کے بعد بھی حضرت مولاناؒ نے مثنوی کو نامکمل سمجھا اور اس کو کعبہ دل کے لئے طواف گردانتے ہوئے، ساتویں دفتر کی ضرورت محسوس کی ادھر حضرت جلال الدین رومیؒ اور شمس الدین تبریزی کی طرف سے اشارہ ہوا۔ لہذا آپ نے کمر ہمت باندھی اور ساتواں دفتر مکمل کر دیا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اسی دفتر ہفتم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

لیک چوں ہر دفتر است از مثنوی ؛ کعبہ دل را طواف معنوی
تا نہ طوف ہفتمے گردد ادا ؛ چوں شود ہر ہفت نظم مدعا
پس از ایمائے جلال پاک دیں ؛ وز ضیائے آں خور برج یقیں
بہر شرط سابعہ جاں چست شد ؛ چستیم در کار دنیا سست شد
خواہد از آں خالق انوار شمس ؛ گرد از ذرہ بگیرد کار شمس
ایں شررہا چوں بجانم ریختند ؛ شعلہ ہا در سینہ بر انگیختند
اندریں بودم کہ تیغ آں حسام ؛ مثل برق آمد بروں زا بر نیام
تیغ آں تیغ دکان اصفہاں ؛ غوطہ ہا خوردہ بخون عاشقاں
مثل ماہ میم ماہ رخشاں ہلال ؛ ہمچو مہر نیمروز آتش خصال
آہنش از ہند و حدادش از عجم ؛ بحر ہر جوہر عرض بر برق دم

مثنوی معنوی کا یہ دفتر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دو سال بعد سنہ ۱۸۵۹ء ۱۲۷۶ھ میں بمقام رام پور مہماران مکمل ہوا۔ مادہ تاریخ تصنیف "شورش عشق" ہے۔

۱۲۷۶ھ

مولانا کی حیات میں اس دفتر کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور کئی سال تک یہ گرانقدر تصنیف مسودہ کی شکل میں رکھی رہی جب آپ کے مرید اور سوانح نگار حکیم محمد عمر چھتاولی کو حضور سرورِ کائنات صلعم نے خواب میں اس کی طباعت اور اشاعت کا حکم فرمایا تو انہوں نے نظر ثانی اور حواشی کے بعد ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء میں محبوب المطابع میرٹھ میں اس کو طبع کرا کر شائع کیا۔ خود حکیم صاحب نے اس کا مادہ "تاریخ طباعت" نکال کر قطعہ تاریخ لکھا اور مثنوی کے اخیر میں شامل کیا:۔

قطعہ تاریخ طباعت

ایں مثنوی مقبول اللہ	چوں از طبع بمطبع عاطر شد
سال طبعش خوش گفت عمر	بس مطبوع خواطر شد

۱۳۰۹ھ

مثنوی کا یہ دفتر محض ایک مرتبہ طبع ہوا۔ اس لئے نہ اس کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی اور نہ اب وہ عام طور پر ملتا ہے۔ کبھی کبھی بعض کتب خانوں میں یا اہل علم حضرات کے پاس دکھائی دے جاتا ہے، لہذا اس کے بعض حصوں کو یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خطاب بجناب عشق مآب و خواستگاری وصل باری

مرحبا اے دلبر دلباز ما	آخ اے آئینہ غمّاز ما
بستۂ صبر و قرار ما چو آب	کردۂ ما را تو رسوا و خراب

هر بلا و شور کاں اندر جہاں است ⁂ بے گماں از دست تو اے جانِ جاں است

کاش اے غماز آں اسکندرم ⁂ ہمعناں بردی تما سوئے صدرم

ہاں مگر ایں ہم درست است و بجا ⁂ گر نبودے تو کجا بودیم ما

آنچہ ہستی ہستی آگاہ ہم ز تو ⁂ زانچہ جستی جستی آگاہم ز تو

ہرچہ زابرت می چکد لیکن بجاں ⁂ کلک سرگشتہ کند چوں شرح آں

خوش بیا اکنوں کہ بینیم جذب تو ⁂ ہرچہ باشد نہ ز تلخ و عذب تو

تا بکے آخر جدائی اے دلیل ⁂ فردہ بخش از وصالِ آں جمیل

در سرورش تا خوش و خورم زیم ما ⁂ لطف فرما لطف تا بے غم زیم

مثنویم اے محمد نیست آں ⁂ اقتدا آرد بہ کس ز اہلِ زماں

بلکہ آبش چوں ز جامِ معنوی ست ⁂ ہم کلامم ہم کلامِ معنوی است

آنچہ آمد بر لب از ایرادِ عشق ⁂ ارمغاں آوردہ ام با صادِ عشق

در احوالِ سراپا اجلالِ حضرت رابعہ بصری بمعاملہ عشق و عاشقی ذوالجلال

رابعہ را ایں مناجاتِ فخیم ⁂ بود در روز و شب پیشِ کریم

گر پرستش کردہ ام از ترسِ نار ⁂ بے تکلف سوز در دوزخ چو خار

ور برائے طمع ہست از بہرِ بہشت ⁂ کن حرامم آں گلستان و بہشت

ہاں پرستیدم ترا گر بہرِ تو ⁂ عواں پے دیدارِ خود در شہرِ تو

روزے آں مستغرقِ عشقِ خدا ⁂ با ہزاراں سوز و ساز و وجدہا

در کفے بگرفت کاسِ آبِ سرد ⁂ در کفِ آتش بصد گرمی و درد

وزیرو شوریدگی ہا نعرہ زن — حبت از ہجائے و بلیات ندا ایں سخن

اے کجا ہست آں جہم وآں جناں — تا زنم آتش دراں آب اندراں

کیں دو در خوف و رجائے خویشتن — بازدارند از غم آں فرد من

فی شرح الحدیث: تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ انہ یراک

در عبادت جلوہ معبود را — جا بخشم جسم وجاں دہ عابدا

ورنہ بند و نقش ایں رنگ شہود — شاہد خود شوکہ می بیند ودود

عاشقے کز ہجر دیدن محو اوست — حالتے دارد کہ طرز صحو اوست

سوئے عاشق بنگرد معشوق گر — خوش پذیرد زاں دل وجاں آں اثر

انفعال وافتشا زو دے بود — پس بنجاشی محو ہمسر کے بود

تانکہ باشد رتبۂ الفت دگر — منصب ایں خوف عبدیت دگر

۳۔ شرح حزب البحر۔ حزب البحر ایک دعا ہے جو رد بلا کے لئے پڑھی جاتی ہے، اس کے مصنف حضرت امام ابو الحسن شاذلی یمنیؒ ہیں جو فرقۂ شاذلیہ کے سرقبیل ہیں، ان کا مزار شہر نجد میں ہے۔ حضرت مولاناؒ نے ۱۲۷۲ھ میں جب وہ قصبہ رام پور میں بحالت روپوشی قیام پذیر تھے، دعائے حزب البحر کی شرح فارسی زبان میں لکھی اور اس کے فوائد و خواص بیان کئے۔

تمہید میں فرماتے ہیں کہ دہلی میں جب ۱۲۶۳ھ میں بعد ادائے فریضہ حج حرمین شریفین سے واپس آرہا تھا تو یمن میں رک کر امام شاذلیؒ کے مزار کی زیارت

سے مشرف ہوا۔"

اس کے بعد حضرت مولانا نے اس دعا کا شان نزول یہ بتایا ہے کہ "ایک مرتبہ امام شاذلیؒ مع اپنے مریدین حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے، ساحل سمندر پر محض ایک شکستہ کشتی ملی، حج کا زمانہ قریب تھا اس لئے مجبوراً اسی پر سوار ہو لئے، سمندر کے بیچ میں پہنچے تو کشتی ایک طوفان عظیم میں گھر گئی اور اس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہوا۔ امام شاذلیؒ نے اس وقت یہ دعا پڑھی اور سمندر کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"یَا بَحْرُ اسْکُنْ فَاِنَّ عَلَیْکَ بَحْرَ الْعُلُوْم"

خدا کی قدرت طوفان فوراً ختم ہو گیا، اس واقعہ سے تعلق کی بناء پر اس دعا کا نام حزب البحر پڑ گیا۔ اب یہ دعا صرف طوفان ہی کے موقعہ کے لئے مخصوص نہیں رہی بلکہ ہر مشکل کے وقت پڑھی جا سکتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد کی فارسی شرح کا حضرت مولانا فتح محمد تھانوی نے حاجی محمد صادق کے ایما سے عام فہم اور آسان اردو میں ترجمہ کیا، وہی ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

شرح حزب البحر کے خاتمہ پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی یہ عبارت مختصر ہونے کے باوجود اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے جنگ آزادی کے بعد کے چند واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

"جس وقت یہ فقیر شیخ محمد تھانوی، فاروقی، عمری، مجددی، نقشبندی، چشتی، صابری، سید احمدی، نوری تحریر تصنیف

اور تبییض اس سے شرح حزب البحر سے فارغ ہوا۔ ایک پہر دن چڑھا تھا اور تاریخ بائیسویں ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ بارہ سو ستر ہجری مقدسہ تھی، قصبہ رام پور منہاران ضلع سہارنپور اس حویلی میں جو محل کے نام سے مشہور ہے اور وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، اور جس وقت یہ فقیر اپنے وطن اور مولد اور مسکن سے جلا وطن ہو کر یہاں مقیم تھا ــــ"

۴۔ ارشاد محمدی۔ اردو زبان میں تصوف کا ایک مختصر رسالہ ہے ۱۲۹۲ھ میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوا تھا، منشی غلام بسم اللہ تسمل، منشی محمد احسان اللہ مخیر اور مولوی قاسم علی خواہان نے قطعات تاریخ لکھے، پہلے دو حضرات کے قطعے فارسی میں ہیں خواہاں صاحب نے اردو میں طبع آزمائی کی ہے اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ قطعہ سے رسالہ کا موضوع بھی معلوم ہو جائے فرماتے ہیں: ــــ

چھپکے تیار فضل حق سے ہوا ؛ طرز اذکار اولیائے کرام
سال اس کا ہے باسر بہجت ؛ نادر اعلیٰ اچھی کتاب تمام

اس رسالہ کا موضوع تصوف کے مختلف سلسلوں کے ۱۲۹ اشغال و اذکار کے طریقوں کو بتانا ہے، مولانا نے یہ رسالہ بعض حضرات کی فرمائش سے ۱۲۷۷ھ میں لکھا تھا، چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں: ۔

"حسب درخواست بعضے بھائیوں، اخلاص مندوں

مجھ عاجز اہل میرٹھ سے خصوص مولوی فدا علی صاحب میرٹھی
اور منشی محراب علی صاحب ایوب شہری چند ارشادات طریقہ
علیہ چشتیہ، صابریہ، قادریہ اور طریقہ بہیہ، نقشبندیہ، مجددیہ
خصوص طریقہ ولی اللہیہ عزیزیہ سید احمدیہ نوریہ اور اندک
تر طریقہ مقتدریہ کہ راضی ہو اللہ ان سے اور ان لوگوں سے
جو اپنے اعلیٰ پیر طریقت بیعت وارادت وصحبت ظاہری
ومعنوی سے اغنی نور الاسلام حضرت مولانا شیخ المشائخ
میاں جیو نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہٗ اور پیر طریقت
وبیعت وارادت وصحبت مولانا واولانا حضرت قبلہ
الہدایت والارشاد کعبۃ الصوات والداد امام ہمام امام المسلمین
اسعد اوحد اسمہٗ احمد حضرت سید صاحب بریلوی قدس
سرہٗ سے پہنچے اوپر اس روش کے جو معمول یہ مجھ عاجز کے
ہیں اردو ریختہ زبان میں ہنگام قیام میرٹھ اپنی ۱۲۷۷ھ بہ نظر
نفع عام قید تحریر میں آئے اور نام اس رسالہ کا بہ نظر فی الجملہ
اسم بامسمیٰ ارشاد محمدی رکھا۔"

اس تمہید کے بعد اصل مضمون پیش کیا گیا ہے، جس کو حضرت مولانا
نے اپنی دانست میں "بہ نظر فیض عام" تحریر کیا تھا، لیکن آج کل کے ماحول میں خاص
لوگ ہی اس سے فیضیاب ہو سکتے ہیں، ایک مختصر سے اقتباس سے یہ بات واضح
ہو جاتی ہے:۔

ان لطائف میں ایک حرکت نبضیہ ہے، طالب کو چاہیے کہ اس اس کو خوب دھیان کرکے بغور تمام اسم ذات مبارک سمجھتا رہے یہاں تک کہ ایسا جم جاوے کہ جو خود مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے یہ اعلیٰ رتبہ مشق کا ہے، ادنیٰ رتبہ بیداری ان لطائف کا یہ ہے کہ عین مشغولی کاروبار دنیاوی وغیرہ میں طالب کو لطائف کی طرف متوجہ کرلیں، یہ انعام الٰہی عجیب ہے اور اس سلسلہ والوں پہ طالب کو چاہیے کہ شاکر ہو۔"

۵۔ انوار محمدی۔ یہ رسالہ مولانا کی آخری عمر کی تصنیفات میں سے ہے خود مولانا نے اس کے سنہ تصنیف کا کہیں ذکر نہیں کیا، لیکن آخر میں جو مادہ تاریخ درج ہے اس سے اس رسالہ کا سنہ تصنیف ۱۲۹۱ھ نکلتا ہے۔ یہ مادہ مولوی عبدالحکیم صاحب متخلص بہ حکیم نے نظم کرکے کتاب کے آخر میں شامل کیا ہے

اس قطعہ کے چار شعر ہیں۔ جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

انوار محمدی است برہاں ؛؛ کاندر دل وجاں کند تصرف
در فکر شماء مطلع سال ؛؛ رو داد چو اند کے توقف
فرمود حکیم فیضِ عرفان ؛؛ بے ساختہ نز رہ تکلف
تاریخ دگر کہ بود مقصود ؛؛ دریاب ز نسخہ تصوف

انوار محمدی فارسی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن آخر میں کچھ دردوں کا ترجمہ اردو میں کردیا گیا ہے۔ کل رسالہ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ محمد حیات مطبع ضیائی

میرٹھ نے اس عبارت کے ساتھ طبع کیا:۔

احقر باستجازت جناب مستطاب مصنف صاحب مدظلہم ابن کتاب طبع نمودہ است ہے احسب قانون ۱۸۴۷ء احدی مجاز طبع نیست۔

رسالہ کی عبارت مسجع اور دقیق ہے، شروع میں خود مصنّف بھی اپنی عادت کے بموجب اپنے جملوں کو مشکل سمجھ کر اعنی سے تشریح کرتے چلے گئے ہیں یہ رسالہ اگرچہ مجموعی طور پر شریعت اور طریقت کے بعض مسائل پر مشتمل ہے۔ لیکن موضوعات مختلف النوع ہیں۔ شروع میں سالک کے بعض تجربات اور اس کے قلب کی کیفیات سے متعلق سوالات اور ان کے نہایت تشفی بخش جوابات ہیں مثلاً:۔

سوال — روزے کہ شغل دورہ نمودم تمام شب بمشاہدہ محظوظ ماندم و ازاں ہیچ انوار قدسیہ محسوس نمی گردد۔

جواب — افادۂ مشاہدہ چون لطیف وصافی می شود ادراک آن بر سالک دشوار تر می شود و گمان می برد کہ مرا ہیچ حاصل نیست و اگر مشاہدہ متکیفہ بکیفیتہ و الوان وشیون می باشد در ادراک می آید و میداند کہ مرا مشاہدہ حاصل است حالانکہ مشاہدہ ملون ادق و مشاہدہ بے لون اعلیٰ است کہ ذات الٰہی مستجمع جمیع کمالات و متنزہ و مبرا از جملہ کوائف و بیچون و چگون است ہر چند بے کیفیت باشد مشاہدہ کامل است پس طالب را باید کہ خواہان مشاہدہ بے کیف باشد و آن را بالیقین و بالقطع مشاہدہ ذات پاک داند و ہیچ شک وشبہ را در آن راہ ندہد۔

ان سوالات اور جوابات کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد کچھ تعویذات ہیں۔ پھر صفحہ ۳۰ پر میانجیو نور محمد صاحب کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

فقیر خاکپائے فقراء دین..... بعد اخذ بیعت سلسلہ اجازۃ حاصل شد و نعمۃ خاندان اربعہ مع شعب متفرقہ و شجرات مرحمت داشت کہ آن وقت دیگر یاران و عزیزان از خادمان آن عالی جناب و متعالی جناب موجود بودند کہ اگر ذکر محامد و مناقب آن یاران و ناداران بر صفحہ بیاض بہ تنصیص نوشتہ آید نسخہ ہذا بطول انجامد لہذا باسر ما در دیگر رسالہ مستقلہ انشاء اللہ تعالیٰ منحصر داشتہ شد۔

اس عبارت کے بعد چشتیہ، صابریہ، نقشبندیہ، قادریہ چشتیہ نظامیہ اور سہروردیہ کے مکمل شجرے لکھے گئے ہیں۔ پھر سید احمد صاحب شہیدؒ کا نسب نامہ دے کر کچھ خطوط نقل کئے ہیں۔

پہلا خط حاجی شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی کی جانب سے میانجیو نور محمد صاحب کے نام ہے۔

دوسرا خط حضرت سید احمد صاحب شہید کی جانب سے لاہور کے مسلمانوں کے نام ہے جو حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تحریر کیا تھا۔

پانچ خطوط حضرت میانجیو نور محمد صاحب کی جانب سے حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے نام ہیں، ان خطوط میں سے ایک خط کا ترجمہ گذشتہ صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔

ان مکتوبات کے بعد حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ کی

بعض مسائل پر تحقیقات درج ہیں، جو سوال وجواب کی شکل میں درج ہیں پھر طریقہ مجددیہ کا مفصل بیان ہے۔

آخر میں ادعیہ ماثورہ اور ان کا فارسی ترجمہ ہے، خاتمۃ الکتاب پر ایک صد درود شریف اور ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے، اس حصہ کو "صلوٰۃ وصلوٰۃ محمدی" سے نامزد کیا ہے۔

غرض کہ یہ چھوٹا سا رسالہ شریعت اور طریقت کے متعدد مسائل پر مشتمل اور نہایت جامع ہے۔

۶۔ بیاض محمدی۔ یہ رسالہ عملیات پر مشتمل ہے، مولانا نے فارسی زبان میں تحریر فرمایا تھا، مگر محمد احمد اللہ صاحب مظفر نگری نے ۱۳۵۷ھ میں اردو ترجمہ کرکے ایک خاص ترتیب سے رسالہ عطاء المنان کے نام سے شائع کرایا۔ اس کے متعلق مترجم نے تمہید میں جو نوٹ دیا ہے ہم اس کو نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:۔

> عملیات اور تعویذات میں اگرچہ آپ کو زیادہ انہماک وتوغل نہیں ہوا مگر چونکہ طبیعت کے ذکی وذہین واقع ہوئے تھے محض رفاہ خلق اللہ کے لئے تھوڑی توجہ سے اس فن میں بھی کمال حاصل کر لیا، جہاں سے عملیات ہاتھ آئے تجربہ کرنے کے بعد اپنی بیاض میں درج فرمالیا۔ باوصف اس عدم توجہی کے جنات اور آسیب آپ کے نام سے کانپتے تھے!!

نقل:۔ فقیر مترجم بیاض محمدی کی ایک بنگالی طالب علم سے جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے ۱۳۵۵ھ میں ملاقات ہوئی، بر سبیل تذکرہ حضرت مولانا کا ذکر آگیا، وہ صاحب خود عملیات کا شوق رکھتے تھے مگر مولانا سے واقف نہ تھے

آپ کا اسم گرامی سن کر تعجب و حیرت سے کہنے لگے :-

"کیا یہی وہ مولانا ہیں ؟ جن کا نام ہمارے اطراف میں اب یک مشہور ہے کہ جس وقت کوئی خبیث جن یا آسیب کسی کو ستائے اور اس سے لوگ عاجز ہو جائیں تو شیخ محمد تھانوی ہتیلی پر لکھ کر آسیب زدہ کو دینے سے جن و آسیب فوراً فرار ہو جاتا ہے"

رسالہ بیاض محمدی جو مولانا کا خزانہ عملیات ہے، مولانا کی وفات کے بعد آپ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری قدس سرہٗ کے ارشاد سے حضرت قاضی صاحب کے پیر بھائی حضرت مولانا مولوی سید رحم الٰہی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ نے مکمل طبع کرا کر شائع کرایا، مگر چند ہی روز بعد حضرت قاضی صاحب کے نام خط پر خط آنے لگے کہ آپ نے غضب کر دیا لوگ حب تسخیر کے اعمال ناجائز طور پر عمل میں لا کر فتنے میں پڑ گئے۔ حضرت قاضی صاحب نے یہ معلوم کر کے جس قدر نسخے موجود تھے سب جلوا کر دریا برد کرا دئے اور بقیہ بھی دوگنی چوگنی قیمت دے کر چھپا گئے اور تلف کر دئے اس کی تلافی اس طرح کی گئی کہ بیاض محمدی میں سے وہ عملیات تسخیر وحب جو تیر بہدف اور سہل الحصول تھے نکال ڈالے اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے دوبارہ ترتیب دے کر مطبع مجتبائی دہلی کو دیدیا جنہوں نے بجتبہ اس کو فارسی و عربی میں طبع کرا دیا، اور آج تک وہ انتخاب شدہ رسالہ مطبع مجتبائی سے دو آنے قیمت پر ملتا ہے۔

جس زمانہ میں یہ رسالہ طبع ہوا تھا فارسی زبان کی قدر تھی، مگر عرصہ تیس سال سے فارسی قریب قریب ہندوستان سے مفقود ہو گئی ہے، عرصہ سے اہل علم و شائقین عملیات متمنی تھے کہ یہ مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے، فقیر کو اسی زمانہ سے خیال تھا کہ کسی طرح یہ نایاب اور مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے مگر مکروہات دنیوی سے مجبور تھا۔ آخر ۱۳۵۰ھ میں باوجود ہجوم تفکرات کمر ہمت باندھ کر یہ رسالہ اردو میں مرتب کر لیا اور مخزن عملیات محمدی اس کا نام قرار پایا۔[1]

۷۔ مناظرہ محمدی[2]۔ یہ رسالہ حضرت مولانا کی قوت تصنیف و تالیف کا ایک نادر نمونہ ہے۔ جب آپ حرمین شریفین سے لوٹتے وقت بمبئی پہنچے تو پتہ چلا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے امام فخر الدین رازی کے بعض اقوال کی تردید میں ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے، آپ نے اس کو پڑھا تو بیحد رنج ہوا، فوراً اس کا جواب لکھنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ ایک دن مراقبہ میں آپ کی ملاقات امام فخر الدین رازی سے ہوئی۔ اس سے آپ پر انشراح ہوا اور راستہ ہی میں قلم برداشتہ مولانا فضل حق کی کتاب کے جواب میں ایک رسالہ لکھ ڈالا۔ دہلی پہنچے تو مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور کی خدمت میں پیش کیا، وہ تمہید اور مضمون کو پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ آپ سے گلے ملے اور اس رسالہ پر تقریظ لکھ کر اپنی مہر ثبت کر دی۔

---

[1] رسالہ عطاء المنان [2] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

حضرت مولانا کے اس رسالہ کا موضوع فلسفہ ہے، اس کے متعلق حضرت مولانا قاسمؒ بانی دار العلوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔

"یہ رسالہ اگر کتب درسیہ علم حکمت میں داخل ہو تو قاضی مبارک کے بعد صدرہ کے سخت ذہین آدمی ہی اس کو سمجھ سکتا ہے"[1]

یہ رسالہ طبع ہوا تھا مگر اب نایاب ہے۔

۸۔ قسطاس[2] فی موازنہ اثر ابن عباس"۔ یہ کتاب مولانا عبد الحی فرنگی محلی کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر کی تھی۔

۹۔ رسالہ[3] الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود والشہود۔ یہ ایک غیر مطبوعہ فارسی رسالہ ہے، جو حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا آپ کی قلمی بیاض میں موجود ہے۔ حضرت مولاناؒ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۶۳ھ کو مکہ معظمہ میں خاص حرم محترم کے اندر آپ پر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے پیچیدہ مسئلہ کے بارے میں کچھ انکشافات ہوئے جن کو آپ نے ایک ہفتہ میں ترتیب دے کر قلم بند کیا۔

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء

[2] یہ رسالہ حضرت مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے اس لئے اس کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ اس وقت اصل مقصد یہی رسالہ پیش کرنا اور اسی کے موضوع پر تفصیلی بحث کرنی ہے اس لئے اس کے ذکر کو مصلحتاً موخر کر دیا گیا۔

یہ رسالہ اگرچہ الہامات پر مبنی ہے، لیکن بحث خالص فلسفیانہ اور منطقیانہ ہے۔ حضرت مولاناؒ نے فلسفہ کی اصطلاحات و اصول کو کام میں لاکر ان پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے اور آخر میں وحدۃ الوجود کی جانب اپنے میلان طبیعت کا اظہار کرکے حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے اس کی توثیق و تصدیق کرادی ہے۔ فرماتے ہیں:-

قبل از تسویدِ این سود او سود ؛؛ مجملاً دیدیم در واقعہ کہ بود
در حرم با شیخ یعقوب ام بخواب ؛؛ گفتم از تقریر من دادہ جواب
یعنی تقریرِ آئینہ کادل گذشت ؛؛ گفت کایں وحدۃ وجود آں خود بہشت
حق و انصاف است کہ تو گفتی ؛؛ گوہر ناسفتہ را تو سفتی
لیک در ظاہر نمی گویم فاش ؛؛ تا بزخم عامیاں نبود خراش

پس بہ سلطاں ذکر او مشغول شد
بر دلم فیضان او مبذول شد

اس طرح ایک فتنہ کے ڈر سے دونوں نظریوں کے درمیان مفاہمت کرادی ہے، یہی وہ مسلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد سے اہل تصوف نے اختیار کیا اور اسی مسلک نے اس وسیع خلیج کو ایک حد تک پاٹ دیا جو فرقہ علیہ اور فرقہ درایہ کے نظریوں کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔

حضرت مولاناؒ کے اصل رسالہ کو پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم اور تاریخی پس منظر بتاکر ایک مختصر سا خاکہ ان دونوں نظریوں کا پیش کردیں۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی تشریح اور ان کا تاریخی پس منظر

صوفیہ میں یہ دو اصطلاحیں نہایت طویل عرصہ سے رائج ہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق ایک وجدانی کیفیت سے ہے اس لئے آج تک ان کی واضح طور پر تعریف و تشریح نہیں کی جا سکی اور نامکمل اور غیر معین تشریحات کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جنہوں نے بحث و تحقیق کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا۔

اس وقت تک ان دونوں اصطلاحوں کی جو جو توضیحات پیش کی گئی ہیں، وہ سب سامنے رکھ کر مختصر لفظوں میں ان کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے

نظریہ وحدۃ الوجود کی رو سے وجود صرف ایک ہے اور وہ ذات خداوندی ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء اس کی صفات[1] کے مختلف مظاہر اور شیون ہیں، ہمہ وقت وہ ذات اپنی شانوں کا طرح طرح سے اظہار کرتی رہتی ہے اسی کی طرف قرآن مجید کے یہ الفاظ "کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ" اشارہ کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے بموجب ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں اور ان میں دوئی کا کوئی شائبہ نہیں۔ ذات خداوندی ایک بحر ناپیدا کنار ہے اور اشیائے کائنات اس کی سطح پر لہریں، بلبلے اور بھنور ہیں جو برابر ابھرتے

---

[1] صفات کو ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے صفات کے مظاہر و شیون بالواسطہ ذات کے مظاہر و شیون ہیں۔

INSTITUTE OF ISLAMIC ... M. U

اور مٹتے رہتے ہیں، جس طرح ان چیزوں کی دریا سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں اسی طرح اشیاء کائنات بھی ذات خداوندی سے علیحدہ ہو کر غیر حقیقی اور معدوم ہیں، جیسے دریا اپنی ذات میں حقیقی اور قائم بالذات ہے اور لہریں بلبلے وغیرہ محض عوارض ہیں، اسی طرح ذات خداوندی حقیقی اور قائم بالذات ہے اور اشیاء کائنات محض عارضی ہیں۔ قرآن مجید نے ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی محیط کے پاک الفاظ سے اس سر مکتوم کو آشکارا کر دیا ہے۔

وحدۃ الشہود کا نظریہ دراصل وحدۃ الوجود کے نظریہ کے رد عمل کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اس کے بموجب ذات خداوندی اور اشیاء کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بلکہ غیر ہیں، خدا کی ذات ہماری عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہے۔ کائنات خدا کی ذات یا صفات کے مظاہر نہیں بلکہ موجود بالذات ہیں۔ خدا نے عدم محض سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے خدا اور جملہ اشیاء میں خالق و مخلوق کا تعلق ہے۔ وحدۃ الشہود کے نظریہ کے بموجب اگر سالک کو حالت جذب میں خدا اور کائنات کے درمیان عینیت کا تعلق نظر آتا ہے تو وہ حقیقی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتا ہے جب سالک راہ از دیاد محبت سے سرشار ہو کر ماسوا سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور صرف خدا کے تصور کو ہی اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے تو اس کو ذات خداوندی کے سامنے اپنی ذات اور کل کائنات معدوم نظر آنے لگتی ہے اور وہ اس سرشاری و سرمستی میں کہہ اٹھتا ہے کہ "خدا کی ذات کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں اور اگر کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ وہی ہے" اسی کیفیت میں کبھی وہ "انا الحق" پکار اٹھتا ہے اور کبھی "سبحانک شانی" کہنے لگتا ہے۔ درحقیقت یہ کیفیت اس کے

اپنے جذبہ اور شہود کی کارفرمائی ہے اور واقعیت و اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا سالک کو وقتی طور پر اس وحدۃ کا مشاہدہ ہوتا ہے، اسی لئے اس کو وحدۃ الشہود یا توحید شہودی کہنا مناسب ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں ان دونوں اصطلاحوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس وقت صرف وحدانیت پر زور دیا جاتا تھا معبود ہونے میں کسی کو اللہ تعالےٰ کا شریک گردانا سب سے بڑا بلکہ ناقابل معافی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی پر ایمان کی بنیاد تھی۔ کلمہ طیبہ کا پہلا جز اسی عقیدہ کو مستحکم کرنے کے لئے پڑھا جاتا تھا۔ قرن اول کے صوفیا اور اولیا بھی اسی عقیدہ پر کاربند رہے اور انہوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اصطلاحیں استعمال کر کے کبھی ذات خداوندی اور کائنات کے تعلق کی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اتباع شریعت ان کا مقصد اور تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ان کا منتہائے نظر تھا۔

دو تین صدیاں گذرنے کے بعد حالات بدلے، مختلف اثرات نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں تبدیلی پیدا کی۔ تصوف میں بھی طرح طرح سے رنگ آمیزی ہونے لگی۔ باطنی اصلاح کے لئے لفظ "احسان" کو ہٹا کر "تصوف" نے اس کی جگہ لی، غالباً حضرت ذوالنون مصری نے بعض بیرونی اثرات کے تحت نہایت دھیمے سروں میں وحدت الوجود کا نغمہ الاپا۔ آہستہ آہستہ یہ لے بڑھتی گئی اور آخر کار حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے نہایت بلند آہنگی سے اس کو پیش کیا، ان کی آواز میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ اس کی صدائے بازگشت ہر طرف سنائی دینے لگی۔

نظریہ وحدۃ الوجود ہی اصل و اساس دین سمجھا جانے لگا۔ آیات قرآنی کی تشریح و تفسیر اسی نہج پہ ہونے لگی گویا پورا قرآن اسی نظریہ کی اشاعت کی غرض سے نازل ہوا تھا۔ بعض احادیث بھی ایسی فراہم کر لی گئیں جن سے اس نظریہ کی تائید ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ غرض پورا تفکر اسلامی اسی رنگ میں رنگا گیا انتہا تو یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کے جزء اول لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم لا معبود الا اللہ کی جگہ لا مقصود الا اللہ اور لا موجود الا اللہ لیا جانے لگا۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ اس نظریہ کے انتھک مفسر تھے، انہوں نے نہ معلوم کیا سمجھا اور کیا کہا، لیکن بعض اہل اللہ نے ان کے زمانہ میں اور بعض نے ان کے بعد ان کی ہمنوائی شروع کر دی۔ ان مقتدر ہستیوں میں مولانا جلال الدین رومی، صدر الدین قونوی، فخر الدین عراقی، احد الدین کرمانی، مولانا جامی اور محب اللہ الہ آبادی کے اسماء بہت اہم ہیں۔ ان واقفان راز نے جب نہاں خانۂ دل کے اس سر مکتوم کو متواتر اور مختلف طریقوں سے دوہرایا تو دوسرے بھی ان اشاروں کو لے اڑے اور چونکہ ان کی فہم اصلیت و حقیقت تک نہ پہنچ سکی اس لئے اس کی ایسی تشریحات و تاویلات پیش کیں جنھوں نے اس نظریہ کو بڑی حد تک مسخ کر دیا اور اس میں زندقہ کی پوری شان پیدا ہو گئی۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے نظریہ وحدۃ الوجود اس قدر بدل گیا کہ اس میں اور نظریہ حلول میں کچھ فرق باقی نہ رہا، یہ دیکھ کر شیخ مجدد نے اس کی اصلاح کی جانب توجہ کی۔

ان کے کشف نے ان کو یہ بھی یقین دلا دیا کہ وحدت الوجود کا نظریہ درحقیقت سلوک کی ایک درمیانی کیفیت ہے۔ سالک راہ جب منزل فنا میں داخل ہوتا ہے تو ایک طرف وہ اپنے بشری خواص کو فراموش کر دیتا ہے اور دوسری جانب اشیاء کائنات سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے اس وقت اس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہر سمت اور ہر جہت میں خدا کی ذات و صفات جاری و ساری ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی شے موجود ہی نہیں، اس وقت کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسی سورج کی تیز روشنی پھیلنے کے بعد چراغوں اور چاند ستاروں کی ہوتی ہے۔ خارج میں تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں لیکن ضیائے مہر کے سامنے معدوم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بوقت شہود تجلیات الٰہی سب چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہیں لیکن حقیقتاً نہ وہ معدوم ہوتی ہیں اور نہ ان کو معدوم سمجھنا چاہیے۔

حضرت شیخ مجدد رح نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر فرمایا کہ مجھ پر بھی یہ کیفیت گذر چکی ہے، جب میں مقام عینیت پر پہنچا تو سوائے ذات خداوندی کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا، میں اس وقت توحید وجودی کو حق سمجھنے والوں میں تھا کچھ عرصہ بعد جب میں اس مقام سے نکل کر راہ سلوک میں آگے کی طرف بڑھا تو مقام ظلیت پر فائز ہوا، اس وقت مجھے اپنے پہلے تجربہ میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہونے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ خدا کی ذات اور کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں ہیں بلکہ اصل اور ظل کا سا تعلق رکھتے ہیں۔ جس طرح ظل اصل سے جدا اور اصل کے مقابلہ میں غیر حقیقی ہوتا ہے، اسی طرح کائنات بھی ذات خداوندی سے جدا اور غیر حقیقی ہے، تاہم چونکہ ظل کا وجود کلیتاً اصل کا رہین منت ہوتا ہے

اس لئے وحدۃ الوجود کا ایک ہلکا سا تصور اس وقت بھی قائم رہتا ہے، اس مقام پر پہنچکر میں نے اس کمزور سے تعلق ہی کو غنیمت جانا اور خواہش کی کہ اس مقام سے نہ نکلوں، لیکن کچھ عرصہ بعد جب راہ سلوک میں آگے قدم رکھا تو محسوس ہونے لگا کہ یہ کیفیت بھی عارضی اور حقیقت سے بعید تھی، اب میں مقام عبدیت پر فائز ہو چکا تھا، اور مجھے واضح طور پر نظر آنے لگا تھا کہ خدا اور کائنات ایک دوسرے سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ خدا خالق کائنات ہے اور اس نے جملہ اشیاء کو عدم محض سے پیدا کیا ہے، ذات خداوندی کا عرفان انسان کے عقل و فہم، ادراک و مشاہدہ اور وجدان سے ماورا ہے، انسان کسی طرح بھی اس کی ذات و صفات کو سمجھ اور پہچان نہیں سکتا وہ ذات اور اس کے ساتھ اس کی تمام صفات ہر حیثیت سے وراء الورا ہیں۔

سبحانہ وراء الوراء ثم وراء الورا ثم وراء الوراء

حضرت مجدد الف ثانی نے جب اس امر کا قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دیا کہ ذات و صفات خداوندی کا عرفان انسان کے لئے ناممکن ہے تو اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمادیا کہ تصوف کا مقصد عرفانِ ذات و صفات نہیں بلکہ تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس ہے۔

غرض شیخ مجدد نے وحدۃ الوجود کے نظریہ کی تردید اس قدر وثوق و اتقان کے ساتھ کی اور اپنے استدلال کی بنیاد منطق و فلسفہ پر نہیں بلکہ کشف و شہود اور روحانی تجربات پر رکھی کہ کسی کو ان کی مخالفت کی ہمت نہ ہو سکی ان کے اس اجتہاد نے سب کو غور و فکر میں مبتلا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ مجدد کے ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو دن بدن قوت پکڑنے لگا۔

ایک صدی گزرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کا دور آیا، اس وقت ملک میں دونوں نظریوں کے ماننے والے موجود تھے، اس اختلاف کو دیکھ کر ایک حقیقت کے متلاشی نے حضرت شاہ صاحب سے رجوع کیا، انہوں نے جواب میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود" ہے، اس میں بدلائل قویہ یہ امر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شیخ اکبر کا وحدۃ الوجود اور شیخ مجدد کا وحدۃ الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ ان میں مطابقت ہے مخالفت نہیں۔ نیز شیخ مجدد کا ان کو ایک دوسرے سے الگ سمجھنا تسامح کی بناء پر تھا۔

اس بات کو حضرت شاہ صاحب نے طرح طرح سے سمجھایا ہے فرماتے ہیں:۔

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دو لفظ ہیں کہ دو جگہ بولے جاتے ہیں (۱) کبھی تو مستعمل ہوتے ہیں بحث میں سیر الی اللہ کے تو کہا جاتا ہے کہ اس سالک کا مقام وحدۃ الوجود ہے اور اس سالک کا مقام وحدۃ الشہود ہے اور معنی وحدۃ الوجود کے یہاں استغراق ہے، ایسی حقیقت جامعہ کی معرفت میں جو عالم کو فانی کرتی ہے اس حیثیت سے کہ وہ ساقط ہو جائیں اور وحدۃ الشہود کے معنی ہیں احکام جمع و تفرقہ کا جمع کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ سب چیزیں واحد ہیں ایک وجہ سے اور مغائر ہیں دوسری وجہ سے۔ اور یہ مقام پہلے مقام سے اتم اور ارفع ہے۔

(۲) کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں لفظ مستعمل ہوتے ہیں، حقائق اشیاء کی معرفت میں جیسے وہ ہیں۔ چنانچہ حادث اور قدیم کے ربط پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک قوم کے نزدیک عالم اعراض مجتمعہ ہیں حقیقت واحدہ میں۔ مثلاً موم

سے انسان، گھوڑے اور گدھے کی مورتیں بنالی جائیں، اب باوجودیکہ ان سب مورتوں میں موم کی طبعیت باقی رہتی ہے لیکن ان مورتوں کو موم نہیں کہا جائے گا بلکہ انسان کی مورت کو انسان، گھوڑے کی مورت کو گھوڑا اور گدھے کی مورت کو گدھا کہا جائے گا۔ غور کیا جائے تو وہ مورتیں حقیقت میں تمثالیں ہیں جن کا خود کوئی وجود نہیں بلکہ وہ موم کے سبب وجود رکھتی ہیں جو فرقہ یا قوم اس طرح ماہیت اشیاء پر غور کرتی ہے اس کا نظریہ وحدۃ الوجود کہلائے گا۔ اب ایک دوسری قوم کو لیجئے، اس کے نزدیک عالم اسماء و صفات کے عکس ہیں جو اعدام آئینوں میں منعکس ہوکر مختلف شکلوں میں رونما ہوئے، وہ اعدام جو ان اسماء و صفات کے بالمقابل ہیں، جیسے قدرت کے مقابلہ میں عدم کہ وہ عجز ہے تو جب قدرت کی روشنی عجز کے آئینہ میں منعکس ہوئی تو قدرت ممکنہ وجود میں آئی اسی طرح باقی صفات کا حال ہے۔ اس نظریہ کو وحدۃ الشہود کہا جاتا ہے۔"

غرض نہایت طویل بحث کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ان الفاظ میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کی رائے سے اتفاق کیا۔

"اسی طرح کلام مولانا عبدالرحمٰن جامی کا میرے نزدیک مسلم ہے کیونکہ ان کا مقصود نفی ہے اصل ہونا حقائق کا اس کے مقابل کہ وہ اعتبارات اور اضافات ہیں۔ ان کا مقصود یہ بتانا ہرگز نہیں کہ وجود حق ظاہر ہوا اشیاء میں اور ان ہی کی وجہ سے اس کا تعین ہوا، نہ ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور کائنات کا فرق محض اعتباری ہے۔"

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک درمیانی راستہ اختیار کرکے ان دونوں نظریوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی اولاد اور ان کے متبعین و معتقدین نے ان کی روش پر قائم رہ کر ان دلائل کو جو شاہ صاحب نے پیش کی تھیں تقویت پہنچانے کی سعی کی، مگر شیخ مجدد کا اثر اتنا گہرا تھا کہ ان کے نظریہ کی حمایت کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوئی، بعض نے تو اسی پر اکتفا کی کہ حضرت شیخ مجددؒ کے نظریہ کی مزید وضاحت کریں اور بعض اس حد تک آگے بڑھے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی اس توجیہہ کو ہی سرے سے مسترد کر دیا جو انہوں نے دونوں نظریوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے کی تھی۔ پہلے گروہ میں خواجہ میر ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد ہیں۔ اور دوسرے گروہ میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اور مولانا غلام یحییٰ بہاری ہیں۔

میر ناصر عندلیب نے "نالہ عندلیب" میں مجملاً نظریہ وحدۃ الوجود کی تردید کی اور صاف الفاظ میں اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا۔

وحدۃ الوجود سراسر غلط ہے اور وحدۃ شہود قرین صواب ہے، گو حال و کیفیت کے اعتبار سے دونوں کا منشاء ایک ہو یعنی ماسوا سے نظر کا ہٹ جانا

خواجہ میر درد نے اپنے پدر بزرگوار کی طرح وحدۃ الوجود کو کلیتاً غلط تو نہیں بتایا البتہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے معنوں کا تعین کرکے "عینیت" کے نظریہ کی تردید کر دی ہے اور اپنی اس توضیح و تشریح کے نتیجہ میں وہ تقریباً شاہ صاحب اور مولانا جامی کے ہمراہ ہو گئے ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے رسالوں

"واردات درد اور علم الکتاب" میں فرماتے ہیں:۔

"وحدت وجود کے فقط یہ معنی ہیں کہ موجود بالذات صرف وہی ہے اور یہ معنی نہیں کہ واجب اور ممکن کی ماہیت ایک ہے اور عبد اور معبود ایک دوسرے کا عین ہیں یا اللہ کلی طبیعی کی طرح اپنے افراد میں موجود ہے، کیونکہ یہ سراسر زندقہ ہے۔
...... مذہب میں توحید وجودی کی بایں معنی کوئی اہمیت نہیں کہ وجود موجودات میں ساری ہے کیونکہ کثرت میں وحدت جو عوام کی زبان پہ ہے اور ہر ہندو جوگی بھی اس پر گفتگو کرتا ہے نیز اس کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں بالکل مبتذل مسئلہ ہے جو ذرا سمجھانے سے سمجھ میں آجاتا ہے، لہذا انبیاء کی بعثت کا مقصود نہیں ہو سکتا ہے"

وحدۃ الشہود کے یہ معنی ہیں کہ ذات واجب کے بغیر موجودات ممکنہ کا وجود نہیں ہو سکتا اور موجودات اسی ایک ذات کے نور سے موجود ہیں...... "کل من عند اللہ" کے مطابق ہمہ از دوست کی تصدیق وحی سے ہوتی ہے، اس لئے ہمہ اوست غلط ہے اور ہمہ از دوست صحیح ہے...... نتیجہ یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ نفس الامر کے اعتبار سے باطل ہے وحدت شہود حق ہے۔ لیکن کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری

سے آزاد کرنا"

دوسرے گروہ میں سے مولوی غلام یحییٰ نے اس موضوع پر نہایت شد و مد سے بحث کی ہے اور حضرت شاہ صاحب کی پوری طرح تردید کر دی ہے وہ کہتے ہیں:۔

"شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ وحدۃ وجود اور وحدۃ شہود حقیقت اشیا اور حادث و قدیم کے مابین ربط کو ظاہر کرتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے سراسر غلط ہے۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان کوئی تطابق کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ وحدۃ وجود کی بنیاد عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے اور وحدۃ شہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریت محض ہے"

غرض شیخ مجدد کے اثر سے یہ مسئلہ صوفیہ کے مابین بحث کا ایک اچھا موضوع بن گیا، جو لوگ نظریہ وحدت الوجود کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے ان کو بھی اس میں ترمیم ضرور کرنی پڑی، بعض نے تو حضرت شاہ ولی اللہ کے خیال کو بہ تغیر الفاظ پیش کر کے شیخ اکبر کے نظریہ کو محفوظ کرنا چاہا۔ مثلاً:۔

"وحدۃ الوجود کا یہ مفہوم نہیں کہ ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ذات کا اثر اشیاء میں اس طرح ہے جس طرح شیرینی مختلف قسم کی مٹھائیوں میں[1]"

---

[1] سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ از وحید احمد مسعود ص ۵۰

بعض حضرات نے اس اعتراض سے بچنے کی کوشش کی کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ فلسفہ ویدانت اور نواشراقیت سے ماخوذ ہے اور اعتراض کرنے والوں کو ان الفاظ میں جواب دیا:۔

"یہ ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ مسلمان صوفی عالم کو عین حق سمجھتے ہیں اور باقی دوسری جماعتیں عالم و موجودات میں کثرت ڈالتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلمان صوفیوں نے دیکھا دیکھی اس اصول کو مختلف نظریوں سے مستعار لیا ہے محض دھاندلی کی بات ہے اور ناواقفیت کی علامت ہے"[1]

عینیت کی یہ حسین توجیہہ بھی پیش کی جانے لگی ہے:۔

"عینیت کے یہ معنی نہیں کہ مخلوق خالق کی ذات کی عین ہے بلکہ یہ مفہوم ہے کہ سالک بہ ہوش و حواس حالت صحو میں فنائے صفات بشریہ کے بعد عین الیقین اور اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ کیفیت وحدۃ الوجود کی طرف لے جاتی ہے اور چونکہ مشاہدۂ تجلیات عین الیقین کے درجہ میں رہ کر کیا جاتا ہے اس لئے وحدۃ الوجود کی بنیاد "عینیت" کہی جاتی ہے۔ وحدۃ الشہود سے علم الیقین حاصل ہوتا ہے اس لئے اس کی بنیاد "ورایت" بتائی جاتی ہے"[2]

---

[1] سوانح خواجہ معین الدین چشتی ص ۵۲ [2] عبدالغفار خان صاحب۔

اور دونوں نظریوں میں مفاہمت کی اس طرح بھی کوشش کی گئی ہے :۔

حقیقت تو وحدۃ الوجود ہی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو اپنائے بغیر معرفت خداوندی حاصل نہیں ہوتی، لیکن حالت عروج میں جب سالک خدا سے قریب ہوتا ہے اسے وحدۃ الوجود کو حق ماننا پڑتا ہے اور یہ سیر فی اللہ کا مقام ہوتا ہے اور جب حالت نزول میں سالک کو نظام دنیا کی غرض سے بندوں کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو وہ وحدۃ الشہود کہنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ وحدۃ الوجود کہنے سے عوام کو غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ سیر عن اللہ کا مقام ہے[1]"

غرض اس ضمن میں طرح طرح کی تعبیریں اور توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن بمصداق

ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتا ہے اور حقیقت کا متلاشی شاعر کی زبان میں کہہ اٹھتا ہے :۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ؎ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

یا اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ؎ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے، نظریہ وحدۃ الوجود کو سب سے پہلے اس اہتمام کے ساتھ حضرت محی الدین ابن عربی نے پیش کیا تھا اور ان کے بعض

---

[1] عبدالغفار خاں صاحب۔

ہمعصروں نے اس کی اشاعت کی تھی۔ ان بزرگوں نے سرشار محبت ہو کر اس راز محبت کو فاش کرنے کی جسارت کی تھی، ان سے پہلے منصور نعرہ "انا الحق" بلند کر چکا تھا لیکن اس کو ایک نعرہ مستانہ سمجھ کر کسی نے اس کا اثر نہیں لیا تھا، مگر ان حضرات نے اس کو جذب و مستی کی ایک کیفیت نہیں رہنے دیا بلکہ اس سر محبت کو اس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ بادۂ محبت کے متوالے اس کو صدائے حق سمجھ بیٹھے اور تصوف کی عنان اسی سمت میں موڑ دی گئی یہ عقیدہ خواص سے گذر کر عوام میں پہنچا تو اور بہت سے غلط تصورات قائم ہو گئے، مسلمانوں کی عبادات، ان کی قوت عمل، ان کی جمالیاتی حس غرض سب چیزیں اس سے متاثر ہوئیں اور بعض گمراہ لوگوں نے شریعت کو علی الاعلان ایک ادنیٰ شے کہنا شروع کر دیا۔ عبادت کا مقصد عرفان ذات کہا جانے لگا۔ نصب العین حیات معرفت خداوندی کو بنا لیا گیا، جس کی وجہ سے عمل کی قوت میں ضعف پیدا ہو گیا، شعر و شاعری اور ادب میں اس نظریہ کی پوری طرح کارفرمائی ہو گئی۔ یہاں تک کہ اردو کا سب سے عظیم شاعر غالب جو خود صوفی نہیں تھا لیکن جس نے تصوف کے مسائل کو واقفان راز کی طرح اپنے کلام میں جگہ دی یہ نظریہ پیش کرنے پر مائل ہوا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

غرض زندگی کا دھارا تعلیمات اسلامی کی مخالف سمت میں مڑ گیا مسلمانوں میں جہاد کی روح کمزور ہو گئی اور ان کے مزاجوں پر خانقاہیت کا غلبہ ہو گیا، رفتہ

رفتہ وہ سیادت و قیادت سے ہاتھ دھو بیٹھے، یہی وہ انقلاب تھا جس نے بقول علامہ اقبال مسلمانوں کی ذہنیت کو کلیتاً بدل ڈالا اور نظریہ وحدۃ الوجود امت مسلمہ کے لئے تباہی بغداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوا۔

اس خرابی کا باعث درحقیقت نظریہ وحدۃ الوجود کی غلط تعبیر اور اس کا غلط محل استعمال تھا۔ جو چیز حال تھی اس کو قال بنا دیا گیا اور محرمان راز سے گذر کر یہ مسئلہ عوام تک پہنچ گیا جو اس کے کنہ و حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور کیفیت کو حقیقت و اصلیت پر محمول کرنے لگے، صوفیا کرام نے یقیناً ذات خداوندی اور کائنات میں عینیت کو محسوس کیا ہوگا، لیکن یہ ان مقدس روحوں کا حال تھا، انہوں نے اس کو وحدۃ الوجود کے نام سے تعبیر کیا یا وحدۃ الشہود کہا ان کے لئے دونوں طرح روا تھا، عوام نہ اس باریک فرق کو سمجھ سکتے ہیں، اور نہ انہیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت ہے، ان کے لئے وحدانیت پر عقیدہ رکھنا فرض ہے۔ ضروری ہے کہ وہ وحدانیت کو اساس دین خیال کریں اور اسی کی روشنی میں ذات خداوندی اور کائنات کے تعلق کو سمجھیں۔ خداوند قدوس کو اپنا خالق و مالک سمجھ کر اس کے احکام پر چلنے کی کوشش کریں، یہی شریعت کا تقاضا ہے اور اسی راستہ پر چلانے کے لئے ہمارے ہادی سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ ؕ

(ختم)

الہاماتُ الموجودُ الودودُ

فی

تحقیقِ وحدتُ الوجودُ والشہودُ

یافتّاح

رب یسّر — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ — وتمم بالخیر

سُبحانک یامن کان موجودًا بوجودہٖ السّرمدی وکان واحدًا منفردًا بوحدتہ التوحدی وکان علمہٗ بذاتہ لذاتہ المتحمن بصفاتہ المتعلقیة تابدی وکان متعالیًا فی معارج القدس ولم یزل متنزہًا عن التنزل لتکثری التعددی ثم تبرقع بالظہور والبروز الازلیة بینمائز المراتب فی العوالم الامثال التجددی وما تلوّث نقطتہٗ وحققی یا الوارث الممکن الدورلہ ذی المتنقلی ومبین عن سائر نقاط المیمات الممکنات بتشرافتہ مطلعتہ انوار جمالہ مع کمالہ فی مقام المحبوبیة نقطة المحمدی ہی نقطة الاحمدی ان زالتنزل التغائر التعددی فصل علی المحبوب المحمد الاحمد وٰالہٖ وازواجہٖ و صحبہٖ الذین ہم مبیّز وبرعمایۃ التفریق بین المراتب بین الوحدتی وتنزلتی -

اما بعد دوستداران عالم خاکیائے افراد بنی آدم ہیچ مج زبان ہیچمدان درم ناخریدہ و صاحبدلان عارفان قلیل البضاعت والاستطاعت عدیم المعرفت

والصناعت از آستانہ بوستانِ صاحب معارف واسرار و متقیان پرتوِ چلچراغ[1] انوار صدر الاولیاء والابرار قطب الامصار والاکوار[2] والبراری والبحار شیخ المشائخ والاولیاء حضرت ولی نعمت مولانا میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی لوہاروی قدس اللہ اسرارہ العزیز ونوّر اللہ انوارہ العزیز فقیر شیخ محمد تھانوی بن مولوی حمد اللہ خاں عمری فاروقی نسباً تھانوی میلاداً و وطناً صوفی صافی مشرباً چشتی صابری ونقشبندی مجددی سلسلۃً سید احمدی ولیعقوبی ذنوری شعبتۃً و حنفی مذہباً واسحاقی تلمذاً بنغمۂ جاں مترنم کہ چوں فقیر از مطالعہ اسولہ و اجوبہ وردّ و قدح یکے بر دیگرے وایراد والزام وتقریب تام فیما بین اسلاف کرام کہ یکے ملقب بہ لقب علینیہ و دیگر بورائیہ بعض از فریقین بہ تلحید و تضلیل و تحمیق و تجہیل فیما بین بمبالغت پرداختند در مسئلہ ذات پاک سبحانہ و صفات او وحدۃ وجود وحدوث عالم متردد و سرگرداں بود کہ بارخدایا سر ملتۂ فرقۂ ورائیہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قطب ربانی اند و سالارِ قافلہ فرقہ علینیہ حضرت شیخ اکبر شیخ محی الدین محمد بن عربی و شیخ کبیر شیخ صدر الدین قونیوی معاصر حضرت مولانا روم و شیخ ثانی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس اللہ اسرارہم آخر الامر بتاریخ ہفت دہم ذی قعدہ سنہ یکہزار و دو صد و شصت و ۱۲۶۳ سہ ہجری علی صاحب الصلوٰۃ والسلام بعد نماز تہجد در مکہ

---

[1] ستونے را گویند کہ دراں طاقچہ بسیار باشند و دراں چراغاں روشن کنند و بالفعل بیشتر بر مزارات اولیاء اللہ عوام روشن می کنند

[2] جمع کورہ بمعنی قریہ صغیرہ وقصبہ نیز گویند۔

معظمہ شرفہا اللہ تعالیٰ اندریں اندیشہ عیش باب السلام نزد زمزم ومقام ابراہیم علیہ السلام بہ تجربہ تفکر مراقبہ بہ نیت
حل مشکل بحضرت قدس مراقب شدم بفضلہ تعالیٰ از عالم غیب بر دل فقیر ایں تقریر ریختند خواست کہ
ایں عقائد قدسی را بدام سطور در قفس عنصر تحریر بند کند وچون در ایں عالم تجزی اکثر عقائد ہیچ مسمی
یافتہ نمی شود ناچار بہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود نام نہاد

الہام اول تصویرش آنکہ ذات پاک یعنی ذات مطلقہ از قید اطلاق
وتقید و بانواع تعین کہ تغیر و بانات ونسب و اضافات و وہم ادراک
وتعینات و اشارات را در آنجا رسائی ممکن نہ باشد وہیچ پرندہ پر زدن وہیچ
گردندہ گرد گردیدن نمی تواند این قسم تعین بے کیف کہ عبارت از وجود است
کہ بفارسی ہستی نامند و عین ذات است از قبیل الفاظ مترادفہ فی حد ذاتہ لذاتہ
بے شائبہ غیر بالاستقلال بہ بساطت در بساطت موجود است بوجود واجبی
وثابت شد بہ ثبوت ذاتی چہ ثبوت خیر محض است نفی شر محض است و
امتداد زمان را کہ موہوم است وحیز مکان را کہ معدوم چہ یارائے کہ متوجہ
بہ جناب قدس شوند و ذات پاک در اول الاوائل ومبدء المبادی وازل
الآزال و آخر الاواخر وابد الآباد و ظاہر الظواہر و باطن البواطن تسرمدی دارد کہ
مرکز نقاط ماضی ومنتہی نقاط مستقبل منقرض ومنقطع کہ خبر پیغمبر سرور کائنات
صلی اللہ علیہ وسلم کان اللہ ولم یکن معہ شیئ از ینقسم استمرار وثبوت وتحقق و
وجود وجوب ہستی گویا است ونیز حدیث سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کان اللہ
فی عماء اگرچہ علماء ظاہر رحمہم اللہ از روئے لغت عما را بمعنی ابر تنک تفسیر کردند ولیکن
نزد فقیر ایں معنے مطابق حقیقی بدلائل وشرح ماسبق محال فاما بمعنی خفاء

عن الغیر است یعنی این ذات پاک مخفی بود از غیر و موجود و ظاهر بود فی حد ذاته لذاته که بدین تقریر از حسن انتظام معنی آیت کریمه هو الاول والآخر والظاهر والباطن نیز بر متوقدین منضح خواهد گشت و در آنجا ذکر صفات قدیمه که عین ذات اند و بر ذات مرتبه نه دارند و فضول نمایان شد بلکه (صفات واجبه ازلیه) لطریق[۱] سلوم

---

[۱] خصوصاً صفت علم که بمثابه خانه صفات است که در هر یک حقیقت ثابت مثلاً اراده موقوف است بر علم و تخلیق و ترزیق موقوف بر اراده ، پس همان ذات مرید است که عین علم بود و همان ذات رازق و خالق است که عین علم بود. تعدد محمول است نه در موضوع و این چنین تعدد محل وحدت ذات نباشد. فناعل و محل صفات برذات سوائے تغائر اعتباری که اقتضاء وضع لفظی آن را در مفهوم باعث باشد هیچ شے دیگر پیدا نمی کند چنانکه زید عالم است و کاتب است چه ظاهر است که مفهوم لفظ عالم دیگر است نه که شے موجود دیگر است که صفت علم برائے زید باشد بلکه عالم همان ذات ماخوذ بصفت علم است و هم چنان مفهوم کاتب و عالم دیگر الا همان ذات است ماخوذ بصفت کتابت و بصفت علم پس در عالم و علم و ذات و کاتب تغائر اعتباری است چنانکه در متعالج و معالج یعنی شخصے علاج خود می کند پس همان ذات است که علاج می کند همان ذات است که علاج می کنانند نا بیمار در مفهوم تغائر است و اصلا در ذات نیست پس این معنی و حیثیت صفات حق تعالیٰ را مجازاً غیر او گفتن روا باشد و بآں حیثیت عین او گفتن عین حق است و مبحث در این جا نیست ۔

ملکہ ذاتیہ فی حدِ ذاتہٖ لذاتہٖ بغیر ملاحظہ امرِ خارجی و عوارض ذاتی اند والّا تعدد
قدما کہ منافی مطلوب است اعنی وحدۃ لازم می آید بوے شرک می دہد،
چنانچہ بلا مداخلیہ کسب و اکتساب وصف تہوری در اسد عین اسدیت است و
الّا اشتغالی است محض و محض تمثیل برائے تفہیم است تعالی اللہ عن ذالک
علوًّا کبیرًا۔ اگر ایں چنیں ہستی نہ باشد عین نیستی است تعالیٰ شانہٗ و تقدس
و آنکہ بعض عرفاء مثل حضرت شیخ ثانی شیخ محب اللہ الہ آبادی وغیرہ از متقدمین
و متاخرین گفتہ کہ ذات بحت موجود نباشد بلکہ ؎ صفات موجود است کہ
عین ذات اند کما تحقنا ہٗ الآن و اگر کسے قائل بنفی عینیت صفات و غیریت
برسہ تنہا بودہ مرتبہ توسط یعنی لا عین ذات و لا غیر ذات ثابت کردہ تسامح است
والّا نیک بداند کہ در میدان مناظرہ ثبوت قدم فشردن پائے سوئے قول
بتسامح دیگر صورت نمی بندد و تسامح امرے است مجازی و از مبحث ما بیرونست
چہ سخن در حقیقت است فاما حق ہمیں است کہ گفتہ شد۔

الہام ثانی :۔ و جملہ ممکنات کہ معدوم محض بودند در صفت علم ازلی او تعالیٰ
و تقدس بطریق وجود ذہنی نہ بطریق وجود عینی کہ مورث حلول و اتحاد باشد
نعوذ باللہ منہا ثبوت بے کیف بہ تفصیل تمام می داشتند کہ آں را ثبوت علمی

ؔ و چوں بظاہر تقریر حضرت ثانی یعنی محب اللہ الہ آبادی وغیرہ قدس سرہم
بسبب دقت و لطافت روحش می نماید چہ معرکۃ الآرا است لہٰذا در بادی النظر
مانوس نمی شود۔

نامند یعنی بغیر ماده کدام عنصر و بلا صفت امکان معلومات ذات اقدس بودند
و در مرتبه علم ازلی ثبوتی بی کیف می داشتند بغیر آنکه عین ذات حق باشند و
نه ذات مطلق را ازاں تلوثی بوده باشد بلکه غیر حق باشند حقیقتاً و مفتقر
باو بودند، ایں جا قدم معلوم لازم نمی آید بلکه قدم صفت علم ثابت می شود و
چوں صفت علم امرے است اضافی پس کدام معلوم بودن بے تصور لهذا عالم
بطریق ثبوت علمی معلوم علم شده که راز ازل به وجه دیگر پس افتقار صفت
علم بعالم لازم نیاید[۱] و جمله عالم که امرے ست خارجی و مفتقر بماده امکان بلا شک
و بلا شبه وجودے دارد بوجود امکان غایت ما فی الباب وهمی باشد چنانکه مذهب
شیخ اکبر است قدس سره و مسبوق بالعدم است ناچار حادث است و نیز بدیهی
است که وجود ذهنی امرے است آخر و وجود عینی امر الیست آخر چه مثلاً آتش که در
مرتبه ذهن و ادراک حاضر باشد تاثیرش ممکن نه باشد نه ذهن را ازاں حرقه باشد
و نه آتش را ازاں چیزے تبدل چه از قبیل مکشفات ذهنیه است پس هویدا
گشت که معلومیت آتش دیگر و نفس آتش دیگر همچناں معلومیت عالم دیگر و نفس

---

[۱] و از معلومیت عالم به نسبت علم و بطریق وجود ذهنی افتقار علم هیچ گونه لازم نمی
آید لیکن چناکه هر چیز اثر امکان و عدم وغیره پیشش مرتبه علم حاضر اند چه صفت علم
همیں است ورنه نقص به حضرت علم لازم آید حاشا للّٰه فتدبر [۲] بخلاف آنکه در خارج
عین و خارج باشد پس معلوم شد که در ذهن امرے علمی ست گویا ایں انعکاس در حقیقت
صفت علم است [illegible] آتش همچناں [illegible] عالم [illegible] گفت.

عالم دیگر، اگر معلومیت عالم بطریق ثبوت در علم قدیم در مرتبه قدم آمد عالم چگونه قدیم باشد، ستنان حکما بنیما اگرچه عند البعض معلوم و علم واحد است و علم که صفت قدیم است و عین ذات است ازین جا قائل بقدم عالم و اتحاد عالم شده اند سراپا سوء فهمی است، چه علم هرگاه بمعنی مصدری ملحوظ باشد البته معلوم و علم مرادف باشد لیکن تا نیز مدعا شان بیار نمی شود چه علم باین معنی مفارق است از ماده و عالم مفتقر است باو فاما چون علم به معنی حاصل بالمصدر باشد بمعنی دانش و دانست عبارت است از حالت انجلائیه[1] مرادف معلوم هرگز نه باشد بلکه مرادف ثبوت علمی هم نباشد پس منشا ماده سوء فهمی اتحاد عالم که اصلش عدم است شرارت و خبث ذاتی است به علم که عین ذات است که خیر محض است و نیز قدم عالم منجم شده. فاما تقریر[2] دفع این ایراد ملحدین مخالفت بامذهب حضرت شیخ اکبر قدس سره و من تبعه ندارد چه شان او قائل بغیریت و موجودیت غیر سوای ظل وهمی نشده اند تا قدم عالم و اتحاد او باحق تعالی و تقدس قطعا لازم آید بلکه عالم نزد اوشان عبارت است از ظهور حق در خارج بکسوت ظل موهوم که کثرتی پیدا کرده است مانند ذات بحر و موج آن و نه بامذهب حضرت مجدد قدس سره چه اوشان قائل آمد تغیریت بوجود نه ظلی در خارج و مظهریت و ظهور صفات با عکوس آنها نه که بقدم غیر حق و استقلال او پس وحدت نزد شیخ اکبر قدس سره این چنین است و نزد حضرت مجدد قدس سره این چنین و همین است

---

[1] که منشاء انکشاف و مبدء فیاض است.

[2] یعنی ایراد قدم عالم و اتحاد او با حق تعالی شانه.

حقیقت اعیان ثابتہ تقریر دیگر چنانکہ وجود آئینہ فی ذاتہ لذاتہ موجود است و بوصف محاکات اجسام و اجرام بغیر حلول و اتحاد کہ ایں صفت آئینہ جوہر اصل ما است و عین اوست اگر ایں چنیں آئینہ نباشد سفالی است محض بمقدار و ایں جوہرش کہ اصل آئینہ است قرینہ بر آں آئینہ ندارد و جملہ ممکنات در وے منتقش می شوند بوجود ثبوتے نہ بوجود عینی پس معلوم شد کہ آئینہ معہ جوہر خود بغیر کدام ملاحظہ و کدام حیثیت زائدہ یا متاخرہ کہ آں جوہر عین ذات اوست قبل وجود اجسام منتقشہ موجود باشد و انعکاس آں ممکنات پیش ایں صفت محاکات قبل وجود آنہا ثبوتے دارد بہ تفصیل تمام کہ انتقاش ایں اشیاء باین نقش و نگار بودن تواند ازیں امر قدم جوہر آئینہ کہ عین آئینہ است۔ منقح شد نہ کہ قدم اجرام منتقشہ ازیں جاست۔ منشاء بدفہمی ملحداں کہ بقدم عالم قائل شدند نعوذ باللہ منہا۔ تعالی اللہ عن ان یکون لہ شریک فی الملک و یکون لہ ولی من الذل و نحن نکبرہ تکبیرا۔ تدقیق دیگر چوں عالمیت ازلیت او تعالی شانہٗ بذاتہ لذاتہ و عارفیتہ او بذاتہ و محبیت او بذاتہ لذاتہ و عاشقیتہ او بذاتہ لذاتہ بے شائبہ غیریت محض از تقاضائے کمال ذاتہ لذاتہ بمشابہ شخصے کہ فی حد ذاتہ کمال صفتے از صفات دارد بے شائبہ عجب وغیرہ از اغراض دنیّہ کہ لائق کاملین و مکملین نباشد در کمال خود درنج نگردد بر ایں اکتفا نمی کند بلکہ آئینہ در پیش میدارد و بہ نوع تغایر اعتباری پیدا کردہ آرائش جمال با کمال را مطالعہ فرمودہ گنجینہ عشوہ و ناز و نیاز خود را در خود برائے خود در کشود عشاق جواہر ممکنات عدمیہ کہ در زاویہ خمول مکنون بودند از کتم عدم بیرون آمدہ بر کتف وجود حدوث

زمان و مکاں کہ عبارت از وجود خارجی اند سوار شدند و بہ شور و شر ظہور آوردند تو گوئی قیامتے برخاست و ملنوبہ مضمون حدیث شریف کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق برانگیخت[له] کہ عارف رومی حضرت مولانا جلال الدین محمد قدس سرہ می فرماید ؎

گنج مخفی بد ز پُری جوش کرد		خاک را سلطان اطلس پوش کرد
گنج مخفی بُد ز پُری خاک کرد		خاک را تابان تر از افلاک کرد

و ہر یکے حسب استعداد خود و قابلیت خویش کہ در اصل خود میداشت مظہر آثار صفات حق برآمد ابلیس لعین و تابعین او کہ در ثبوت علمی مائل بشرارت عدم بودند و مظہر صفات قہریہ و جلالیتہ گردید و آدم علیہ السلام و تابعین او کہ مائل بہ خیریت وجود بود مظہر صفات لطفیہ و جمالیت گردید کہ ان اللّٰہ خلق آدم علیٰ صورتہٖ ازاں جزمی وہر و تشارک اصلی اند ایں عالم اشباح میلان و توانش بر واحد جانب جنس خود است و نفرت و تنا کہ از جنس غیر کہ خبر خلاصہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان الارواح جنود مجندۃ حما توافق منہا ائتلف ما تناکر منہا اختلف و کریمہ الخبیثات للخبیثین و الخبیثون للخبیثات و الطیبات للطیبین و الطیبون للطیبات شاہد است بیاں و مولانا روم قدس سرہ تضمین ایں مضمون فرمود ؎

[له] واشہر و معتبر آنکہ از کلام حضرت داؤد علیہ السلام است۔

طیبات آمد ز بهر طیبین ⁂ الخبیثات الخبیثین است همین
ناریان مر ناریان را جاذبند ⁂ نوریان با نوریان بس خوش تنند

و فرد کامل از افراد ممکنات خلاصه اعیان ثابته احمد مجتبی محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم بر آمد و خلعت محبوبیت بر پوشید و این فرد کامل را مخصوص از نسبت ذاتی و اظهار فضل او بر دیگران بغیر شائبه افتقار برگزید و مظاهر شیون کامله خود فرموده بهمان منسوبه عشق بازی که در اصل نگران جمال باکمال خود بذاته لذاته است پرداخت که ان الله لغنی عن العالمین بدان مشعر است یعنی ذات پاک در وجود واجبی خود غنی است از عالمیان که هیچ قسم افتقار خود ندارد چنانکه وجود کلی طبیعی احتیاج دارد بسوئے وجود افراد خود و مقید است باین قید که این چنین عقیده کفر صریح است نعوذ بالله منها تعالی ان یکون مفتقرًا الی احد من المخلوقات فی وجود ذاته وصفاته هی عین ذاته ؎

شاباش آن صدف که چنان پرورد گهر ⁂ آبا از و مکرم و ابناء عزیزتر
صلوا علیه ما طلع الشمس والقمر

و از همین جا منشاء کج فهمی ناتوان بینان بر خاست که بقدم عالم قائل شدند۔

الهام رابع۔ و فرق در احمد و احد که یک نقطه میم است و آن همین فرق است که در الهام ثالث به تحقیقش پرداختیم و حرف میم احمد حد فاصل بر بود نشان از قبیل ممکنات اعدامیه که آن میم در عدم هم موجود است و در امکان نیز موجود و در محمد نیز موجود دلالت صریحه وارد و تفصیل مقام ولایت احمدیه بر ولایت محمدیه علی صاحبهما افضل الصلوٰة والتزکیه او همین سر است چه در مقام احمدیه این حرف میم که جنبۂ

اعظم این کلمات است غیر مکرر است و در مقام محمدیت مکرر است چون اقتضاء
این نقطه ملحوظ کرده شود جانب قدس امکان مائل است چه اصل او ست و چون
این نقطه غیر ملحوظ باشد و انوار قدس متلاشی گردد آنگاه جانب قدس وجوب مائل
باشد که عین پسندیده درگاه وجوب است و هم منوبه عشق بازی است طلسمی برپا
کرده است که عقل عاقل را کار نمی کند که آیا از امکان است یا از وجوب. چنانکه آهن
پاره در آتش باشد و از آثار او متاثر گردد و بزبان جمال گویا است که منم آتش
و چون آثار او بسبب بعض غلبات اصل خبیث الحدید که عین اصالت آنست
باز عود کند هیچ آثار آتش یافته نمیشود. چنانکه شجره موسیٰ صلوٰة الله علیه نبینا
علیه السلام نار می نمود و به ترانه انّی انا الله مترنم بود ازین حال حکایت می
کند و همین را قرب فرائض و قرب نوافل که رموزات و ما رمیت اذ رمیت
ولکن الله رمیٰ و بی یسمع و بی یبصر کنت سمعهٗ و بصرهٗ انّی
مرضت فلم تعدنی و انّی جعت فلم تطعمنی و امثال این ها از آیات و
اخبار و آثار در شرع شریف وارد اند تواند گفت جائے غور است که چون کمترین
مخلوقات از نباتات را منقسم کلمات متکلم شود چگونه در حق بشر که منصب خلافت
بحکم انّی جاعلٌ فی الارض خلیفه دارد مستبعد باشد. والعبد عبدٌ و
ترقّیٰ والرب ربٌّ وان تنزّل و در تاخر میم در عدم بود مصدر شدن
ممکن بآن میم اشاره است ع

گر فرق مراتب نه کنی زندیقی

بدان که هر ممکن آخر بعدم خواهد رسید که ممکن را از عدم چاره نه باشد و اول

ممکن نیز ہماں میم عدم است پس بلحاظ بودن ممکن بعدم پر ضرور است بلکہ از قسم عدم
است اگرچہ بظاہر منو ہم الوجود است فاما در وقت ملاحظہ واجب الوجود معدوم
است چہ ہر شئی بالفعل گویا ہالک است کہ کل شیئ ہالک الا وجہہٗ ازاں خبر میدہد
دو وجود ایں چنیں وجود کہ مابین العدمین باشد سوائے عدم چہ باشد چنانکہ ظہور
مابین الدمین حیض می باشد وہر یکے از اولیاء و انبیاء حسب منصب خود و میلان خود
بانوار قدس کہ در وجود شئی ہماں صاف نوش طفیل یافتند موافق خمار آں مست
بودہ بمنسوبہ عشق بازی می پردازند و قربت و نزدیکی باحق می جویند و ہمچناں موافق
میلان خود بجانب اصل خود کہ عدم است محجوب بحجب و مستور باستار میشوند
کہ آں را تعبیر کردن بہ قبض و بسط می توانند پس اگر موسیٰ علیہ السلام بر مسند
موسائی نشستہ چوں ید بیضاء روشن شد ہم بطفیل عصا ہماں فرد کامل است
کہ مراد ازاں نقطہ محمدی است واگر آدم علیہ السلام دم خلافت زد بخلعہ نفخت فیہ
من روحی سرفراز شد بطفیل روح پر فتوح ہماں فرد کامل است واگر نوح علیہ السلام
بتاج عبداً شکوراً سر برافراشت بطفیل حمد و مقام محمود ہماں فرد کامل است واگر
داؤد علیہ السلام بنوازش نغمہ ہا دلکش نواختہ شد بطفیل و نوازش حروف و صوت
خطبہ او است واگر عیسیٰ علیہ السلام باحیاء اموات زندہ دل شد بطفیل آواز نفخ
نوم جاں بخش او ست واگر ابراہیم علیہ السلام درجہ و مقام پیغمبر است صلہ حضرت
خلعت یافت و بطواف و صلوٰۃ آن خانہ قرۃ العین شد بطفیل طاق محراب ابروئے
قرۃ عین جملہ اعیان ثابت است یارب صل علیہ وسلم دائماً ابداً فقیر گوید ؎

اوچو نقطہ مرکز و ما دائریم ۔۔ گرد او ہر وقت سرگرداں رویم

مفلسیم دیا کہ مازر داریم ؛؛ در تپہ آں ساقی خمار آیم

ویلب صلی وسلم علیہ۔

الہام خامس۔ وہر کسے حسب دستور او وقابلیت خود کہ در الہام رابع گذشت ماخوذ و معتوب و ماجور و مشکور و ایں جبر و ظلم نیست بلکہ معنی جباری است چہ جملہ اعدام ممکنات کہ بہ ظہور آمدہ وہر یکے موافق حوصلہ خود مرتبہ پیدا کردہ است مملوک حق اند ہر چہ خواہد کند کرا مجال کہ دم زند پس اگر کسے را خواہ در عالم اشباح خواہ در عالم مثل خواہ در عالم ارواح ہر چہ خواہد از تنعیم و تعذیب حکم فرماید عین فضل است و عین عدل چہ بدیہی است کہ ہر چہ ہست مملوک وے است و در ملک خود ہر قسم کہ تصرف باشد ظلم نباشد بلکہ ترسیدن ازیں و گفتگو کردن درچنیں مقام اگر ظلم باشد مضائقہ نباشد چنانکہ محقق عارف مولانا روم اندریں ہمی معنی می فرماید ؎

کوزہ گر گر کوزہ را بشکند ؛؛ چوں نخواہد باز و ہم می کند[1]

بلکہ رضا جویان حق را از جنت و نار چہ کار کہ غیر حق است الا بطریق وسیلہ رویت حق و لقاء او بلکہ مرتبت قطب ارشاد بغیر حصول ایں قسم رضاء او و تسلیم عنایت نمی شود

---

[1] اس جگہ حضرت رابعہ بصری کے وہ اشعار بے ساختہ نوک قلم سے ٹپک پڑتے ہیں جو کسی اور موقعہ پہ درج کر دئیے گئے ہیں :-

گر پرستش کردہ ام از ترس نار ؛؛ بے تکلف سوز در دوزخ چو خار

ور برائے خویش ہستم بہر بہشت ؛؛ کن حرامم آں گلستان و بہشت

که اگر حکم باد خال نار علی التابید و التخلید به نسبت وے صادر شود بگشاده پیشانی
چنانکه در جنت رود و در نار داخل شود هر چند دل می خواهد که خود به خود سخن از لب
به تراود فاما از اقتضاء اختصار این رساله بعید است تا نیز این قدر بطریق جرعه
از غدیر کبیر کافی است۔

الهام سادس ۔ پس چون آفتاب جمال احدیت ظهور فرمود و شعشانیت او
هر چار سو ممکنات را فرا گرفت که وکان اللہ بکل شیء محیطا از ان خبر می دهد ناچار هر
ظاهر را مظهرے باید چنانکه ظهور ذاته لذاته بود همچنان همان ظهور ذاته لذاته عکس
ظهور ذاته بغیر و بدین منویه پیدا کرد پس هر شئی ممکن مظهر تجلی ذات پاک او گردید
و هر مظهر از مظاهر از ان تجلی موافق حوصله خود خاکے شد پس در آئینه علم ذات
پاک این اعدام ممکنات بدون مواد عنصر و تشخصات عینیه خود ها مانند آئینه چنانکه
بالا گذشت ثبوتے پیدا کرده اند۔ و ذات پاک را از ان اصلا تلوثے نه شد تو گوئی
در بادی النظر متحد اند۔ نعوذ باللہ منها۔ بلکه فی الحقیقت غیر ذات اند۔ هم چنان تجلی ذات
پاک بر این ممکنات ظهور فرموده و مظاهر خود قرار داد۔ و خود از تلویث آنها منزه۔ نه ممکن
صفت واجب پیدا کرد۔ و نه در واجب از صفت ممکن هیچ نقصانے اثر کرد چنانکه
تابش آفتاب بر سائر اجرام ممکنات تجلی خود می نماید و اشراقیه بدانها ارزانی میدهد
فاما از طهارت و نجاست آنها بے شبه مبرا و مستغنی است۔ و از جمله ممکنات
آفتاب تجلی ذات پاک بر حقیقت محمدیه علیه السلام که بمنزله آفتاب است۔ در سائر
کواکب تجلی فرموده۔ اینست معنی توحید وجودی که به فقیر از عالم غیب رسیده
تعالی عن الحلول و الاتحاد و عن الکون و الفساد هو واجب الوجود موجود

بذاتہ سبحانہ و تعالیٰ عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔

الہام سابع

الہام سابع۔ چنانکہ بر ظاہر است کہ نور جملہ اختران از نور شمس مستفاد است چون نظر باصل نور افتد۔ لاجرم ہر اختر تاریک شد و چون نظر بہ اختران افتد البتہ حقیقت اختران نوعی نورانی باشد۔ فقیر گوید۔ چون شمس نبود ہر یکی روئے نمود۔ چون شمس طلوع کرد گوئی کہ نبود۔ شاعری گوید ؎

رات کو محفل میں ہر یک یار گرم لاف تھا
بزم میں وہ شمع رو نکلا تو مطلع صاف تھا

ہم چناں چون بر کسی آفتاب وحدت طلوع کند۔ بطریق شہود او در مشاہدہ مستغرق گردد و متحیر شود۔ بالضرور ہر شے را بلکہ ہستی خود را ہم گم کند۔ و سوائے مشاہدہ واحد و غیر قدرت نمی بیند۔ چنانکہ سوائے شمس دیگر ستارہ را نمی بیند چہ ہر چیز حتی النفس خود را نیز مستہلک مثل نور آفتاب وحدت داند بلکہ ایں دانست خود را نیز و ایں حالت را باستغراق تعبیر می کنند۔ چنانکہ بہادر شاہ بادشاہ بہادر ما اندریں معنی میگوید

کچھ نظر آیا نہ جب کہ تو نظر آیا تجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا تجھے

فاما حق آنست کہ ایں حالت در وسط سلوک منکشف می شود کہ ایں را وحدت الشہود خوانند۔ و سالق مذکورہ بالا آں را وحدۃ وجود خوانند۔ کہ منتہی سلوک است و بر ہر سالک مکشوف نمی شود و کشف نمی شود۔ تا آنکہ جمیع حجاب منخرق نشوند۔ و جماعت بلند پایہ صوفیاء رحمہم اللہ فرمودہ اند کہ ہفتاد و ہزار حجاب اند۔ فاما حق آنست کہ چون حق تعالیٰ نخواہد۔ و کسی را قبول نفرماید۔ در آں واجب شدن حجب چہ دشوار

که چوں جذبه از جذبات حق و کششی از کششات ربانی مطلق در رسد. منسوبه عشق بازی
مانند آتش طور در حق موسیٰ علیه السلام بدراں گیرند. او را جمیع اغیار بلکه از خودی وے
وارسته کنانند. و بطرف خود در کشند. رزقنا الله و ایّاکم عنایت خداوندی متکفل نشود
هیچ نیست. چنانکه عارف رومی یعنی مولانا روم قدس سرهٗ می فرمایند بے بلے ما عنایات
حق و خاصان حق گر ملک باشد سیاه هستش ورق. چوں سامعان محجوب و کثیف
نمی بودند البته در تحریر ایں حجاب ها بے حجاب می شدم مگر العاقل تکفیه
الاشارت. لهذا پرده داشتم. و وجه افضلیت کشف حالت وحدت وجود
بر کشف حالت وحدت شهود آنست. که وحدت شهود مراد ازاں است سوائے
واحد دیگر را بلکه خود را نیز گم کند. و وحدت وجود آنست که در کثرت وجود واحد
بیند. و نظیرش به شمس و ستاره ها دادیم. پس انصاف باید کرد. که تیز بین و دور بین
کدام است. یعنی آں کس که سوائے شمس نه بیند. چه شمس را هر کدام ضعیف البصر
خواهد دید. آنکس که وقت عروج آفتاب جمیع ستاره ها که نور شاں از آفتاب حقیقتاً
مستفاد است. بیند و داند که سبحان الله چه آفتاب است که هر جا موجود است
و هر یک را فیض می بخشد. و هر یک نه منفصل است و نه متصل. نه در کسی حال است
نه برائے کسے محل است. و نه در وجود خود مقید است در کسی. بلکه هر یکے را ازاں وجودی
است و نورانیتی است. و نه از کسی ایں آفتاب را تلوثے است. و در ضیاء خود و
انوار خود نه محتاج است بکسی. پس گویا ایں همه که همه اند هیچ اند. اگر ایں آفتاب
نباشد. فرضاً ایں همه هیچ اند. و اگر ایں اختراں نباشند او را هیچ نقصی نیست چنانکه
بود همچناں است. و همچناں خواهد ماند. پس تا ایں مرتبه بعنایت حق طالب حق میسر

عجائب می شود۔ پس انصاف را از دست نہ باید داد۔ کہ آیا ایں حالت منتہی سلوک است۔ یا آں حالت پس نگیر سوئے بالا ازیں مقام ارتقاء کردن مناسب معلوم می شود حضرت سلامت فقیر گوید ؎

لنگ لنگاں من قدم بر داشتم ؛ مغز جیدم استخواں انداختم

ایضاً :۔ ؎

من نمی گویم بجز تعلیم حق ؛ کو نباشد خلق را کام و حلق

و نیز بزرگی گفتہ ع در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند۔ آنچہ استاد ازل رخیت ہماں می گویم۔ فاما حق آنست کہ تا نیز مثال آئینہ از شش جہت حیرانم۔ و جیب تمنا تہی دارم کہ لاتدرکہ الابصار وہو یدرک الابصار ولیس کمثلہ شیئ وہو السمیع العلیم۔ وسبحان ربک رب العزت عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین۔ پس ہر عاقی را سزاوار نباشد کہ دریں مقدمات بی تامل بسخن درآید و در حق بودن مسئلہ وحدت شہود و وحدت وجود با نکار نہ آویزد۔ تا کہ ماخوذ بو بال و نکال نگردد۔ و نہ از علماء ظاہر علماء باطن بد عقیدہ کرد۔ و خود را بقلت درایت منسوب کردہ سپرد بخدائے تعالےٰ کند۔ و تا کشف حقیقت بر قول علماء ظاہر کہ از اہل سنت والجماعت اند عمل کند۔ و از جماعت بلند پایۂ صوفیۂ بد گمان و بطاعن در حق ایشاں نشود۔ ایں نکتہ کافی است۔ چہ کاملاں را نکتہ کافی و نا اہلان دفتری ناوافی کہ اموز وہم للناس قدس سرہٗ فرماید کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر۔ و ایضاً کار پاکاں را کہ کیفیت نہد۔ ایں کہ گفتم از ضرورت می جہد در شاعری گوید قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز و دم درکش۔ حسن ایں قصہ عشق است

در دفتر نمی کند فقیر گوید ؎

صد ہزاراں غرق شد ابن السبیل

بحر بے پایاں نہ ہمچو رود نیل

وازیں تحقیق منشاء تضلیل و تجہیل و تحمیق فریقین فیما بین واضح شد۔ والکل من الفریقین مجتہد فالمجتہد یخطی و یصیب واذا کان طالباً للحق فلہ من الحق نصیب و فریقین، بوجوہ موجہہ آں واصل و ظل خارجی در خارج قرار دادہ اند۔ و فقیر ایں چنیں نظائر را و علاوہ بر آں دیگر امثلہ آوردہ و در دیگر الہامات آئندہ می آرد والا بہر حال مآل واحد است۔ جسنک واحد والعبارات مختلف فقیر می گوید ۔

ع شاہدے یک عشق بازاں صد ہزار۔ و ایضاً بحز ما عبدنا نگوئیم پس سوائے ما عرفنا نگفتہ است کس بحمد اللہ اولاً و آخراً ۔

الہام ثامن۔ فاما ایں ہمہ تحقیق و تدقیق در حق طالب عافیت طلب کہ از موشگافی می گریزد۔ و موئے بر تن ہمی خیزد۔ اسلم و انفع آنکہ چوں ہر گاہ لفظ مبارک اسم ذات پاک جل جلالہ از کسے شنود۔ یا نویسد یا بیند یا خود گوید یا در خاطرش خطور کند یا در اندیشہ گذرد۔ غرض بہر حال ہر کس فراخور حوصلہ خود خواہ ذکی باشد خواہ غبی خواہ عامی باشد خواہ عارف خواہ شاغل خواہ غیر شاغل آنچہ کہ معنی بسیط مجرد فوراً بلا تامل می فہمد۔ و بے تردد در خاطرش درآید۔ در حق آں کس ہماں مفہوم مجرد بسیط مفہوم ذات پاک است لغد و تقدس ایں قدر مسلم الثبوت است و معرا است از کاوش بحث و تفکر و مطابق است بہ خبر السرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم برائے مصلحت و از حمر سدراہ فتنہ خام طبعان و محجوبان فرمودہ کہ

لا تفکروا فی ذات اللہ و تفکروا فی آلاء اللہ و صفات اللہ نیز روایت وارد است چہ حق تعالیٰ شانہٗ روبروئے ہر کس خواہ عینی باشد خواہ ذہنی بمرتبہ معبودیت تجلی فرمودہ است و علاوہ برآں در حق او شان تکلف کردن است۔ تا آنکہ از پیش عارفان ایں عجب القاظیت ہر دم متفتح اند و حسب حوصلہ خود ہا در مفہوم بسیط مجرد مستغرق اند۔ واللہ اعلم و احکم چوں نوبت باین رسد۔ مضمون کل شیء ہالک الا وجہہ بطریق معنی حال نہ بطریق معنی استقبال کہ علماء ظاہری فہمند یعنی ہستی ممکن پیش ہستی ذات واجب مستہلک است بالفعل و در حال بروئے تحقیق شود و از اینجا فاینما تولوا فثم وجہ اللہ در معنی کلمہ طیبہ باقصائے مراتب۔ لا موجود الا اللہ آگاہی یابد۔ گو ایں قدر امر از سر حد توحید وجودی در رسد۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

الہام تاسع تنقیح مسئلہ وحدۃ الوجود بایراد تماثیل دیگر از برائے تسہیل و تفہیم و تعقیل او لایا باید دانست کہ بلاشک و بلا شبہ مسئلہ وحدۃ وجود کہ عبارت است از وجود واحد ساری در ہر ذرہ از ذراری بصفت اطلاق از جمیع قیود مع حفظ مراتب چہ اگر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی خواہ واجب باشد خواہ ممکن خواہ جوہر خواہ عرض خواہ قدیم خواہ حادث وغیرہ در ہر درجہ موافق درجہ آں یک وجود است حفظ مراتب ضرور یعنی در واجب واجب و در ممکن ممکن۔ ایں مسئلہ برحق است کہ[1] آیات و

---

[1] چنانکہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ ہمیں مضمون تصریح گفتند۔

احادیث بے شمار و اقوال و آثار خارج از حد و حصار است که اطناب در آں لائق
ایں تحریر مختصر نیست لهذا بر اسرع ترین آیات اندریں باب که سنریهم آیاتنا
فی الآفاق و فی انفسهم الخ و اینما تولوا فثم وجه الله و خبر فخر کائنات آں سرور
صلی الله علیه وسلم لو انکم دلیتم الحبل علی الارض السابع لهبط علی الله که در جامع
ترمذی مروی است اکتفا نموده شد که الجرعة تغنی عن الغدیر و الحبة تحکی عن البیدر الکبیر
هر چند شاهد اقتضاء لیس کمثله شیء و هو السمیع العلیم با وصف ظهور بر وجه
کمال در سر اوقات جلال متواری است مسکت است فاما شورش خاطر که
خو کرده مذاق گفت و شنود است بے اختیار می جوشد که از سر باطن بپائے ظاهر
در آویزد که امر لیست ناگزیر سودائے است علاج ناپذیر تمثیلش آنکه مثلاً وحدت
فی حد ذاته لذاته معرّیٰ از نسب و اضافات و عارضیت و معروضیت ما به التوحد
که عین وجود واحد است و مصدر جمیع مراتب اعداد است نه که وحدت مصدریه
و آں مراتب اعداد منتزعه از اں وحدت و صادره از اں که در قوت باسطه واحد طے
باسطه آں وحدت ثابت بودند از اں وحدت در خارج امتیازی و تغایری بوجود
خارجی پیدا کرده اند آں قدر بساطت و لباطت و استمرار در استمرار دارد که جانب
عدد و معدود بود و خواهد بود یعنی ماضی و مستقبل و در آنجا لَنسیاً منسیا معدود چه عدد
و نماں از عالم ترکیب است و ادنیٰ رتبه ترکیب اثنینیة است و پر ظاهر است
که در واحد نه ترکیبی را دخلے است و نه تحلیلے را و اما بودن عدد و معدود از عالم
ترکیب ظاهر است و ترکیب زماں از راه اجزاء آں نیز ظاهر است و عام
است از آنکه خواه ترکیب عینی باشد چنانکه در معدود است خواه علوی باشد

خواه سفلی و معدود عام است از آنکه مادی باشد یا مفارقی مجردی یا ترکیب ذهنی باشد
چنانکه عدد زمان و لهذا واحد مصداق تعریف عدد نیست چه عند الحساب تعریف عدد
نصف مجموع حاشیتین مقرر است و بدلائل تحقیق ماسبق ثبوت حواشی و مجموعیت
که مستلزم ابتداء و انتهاء و اجزاء است و منافی بساطت است این جمله در مرتبه
وحدت بکقلم بالمره منتفی است و چه یارائے که بجز انتفاء خود دیگر ثابت کشد
و این قدر وحدت واحد ممتنع التعقل است چه از معقول اول است
نه که از معقولات ثانیه الامجهول الکیفیه است. چون این قدر مقدمه مناط تقریر
فهمیده شد سمع گوش ظاهر را گوشمالی داده بگوش هوش باطن بحکم انه الغنی السمیع
و هو مستغنی باید شنید چون واحد خواست که بی چون و بی چگونی درآمد در مراتب
کسوت اعدادیه حکمته تنزل نمود و در هر چه موافق اقتضاء آن مقام کسوة متغایر کسوة
اول پوشیده بلا احتیاج سوئے آن مراتب حکمته و بغیر استکمال بآن مراتب بل محض
از راه اظهار کمالات خود و تفضل یکے بر دیگرے که عین مصلحت تامه که قاله عن عبثیته
ولغویت فعل است که وما خلقناکم عبثا مؤید این معنے است از شانے به شانے
دیگر جلوه نمود که کل یوم هو فی شان وان الله لغنی عن العالمین و هو
الاول والآخر والظاهر والباطن و اشباه این آیات بینات بدین ناطق
اند و لفظ یوم در این جا بمعنی "آن" است نه که آن آن که از اجزاء زمان باشد
چه زمان را سابقاً منقح کرده ایم که از عالم ترکیب است و خود مخلوق است بلکه
مراد از آن آن بسیط است که استمرار در استمرار و تسرمد در تسرمد خبر می دهد
که بمنزله شی واحد است که عبارت است از ازلی که بلا ابد باشد و اول لسان شروع

شریف گاہے بدہر تعبیر فرمودہ کہ در خبر فخر کائنات سید المرسلین صلعم است کہ لا تسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ یسبنی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار یعنی منہم سرمدی فاعل مختار قہار لیل و نہار و تقلیب لیل و نہار شانے است از شیون کہ در مرتبہ کسوت اجزاء در خارج تنزل پیدا کردہ فافترقا یعنی فرق درمیان دہر و درمیان زمان کہ اجزاء زمانیت متجزی است واضح شد تعالیٰ علواً کبیراً پس ازیں جا منشاء مذہب معطلہ کہ بہ تعطیل افعال ذات پاک در جانب ماضی قبل خلق السموٰت والارض قائل شدند باطل شد و ہمچناں مذہب آں کساں ناکساں کہ بہ تعطیل افعال حق تبارک و تعالیٰ در جانب استقبال کہ بعد فیصلہ اقوال و افعال و احوال روز قیامت قائل شدند (نعوذ باللہ) نیز باطل شد الحمد للہ کہ ہر دو عقیدہ باطلہ از اوج گمان فاکد[1] شان بحضیض بطلان مطمورہ نشین گردیدند متنبہ باش تحکم واللہ اعلم باحکم ۔

الہام عاشر ـ مثلاً عدد عشرین کہ بست ہماں واحد است کہ دریں کسوۃ عددیہ خارجیہ در خارج تنزل نمودہ کہ بظاہر متکثر است و بہ باطن متوحد است دریں مرتبہ ترکیب عددیہ و بروز ظہور آں قدر بساطۃ و اکمون و بطون پیدا کردہ کہ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار تلویحی است ازاں مگر ادراک اکتناہش کما حقہ از حیطہ ادراک خروج دارد مگر بہ نظر غائر مجملاً بلاشک و شبہ ہماں وحدت پیدا است کہ از قسم اولیات و بدیہیات است چنانکہ شعلہ جوالہ در حین

---

[1] فاسد ۔

گردش باوجود اشیاء متعدده از قسم مادیات از آتش و پنبه و شمع و موم و چربی وغیره
آں قدر انبساط پیدا کرده که سوائے کرۂ آتش دیگر نمایاں نباشد اگر آتش است
آتش است اگر پنبه است آتش است اگر چوبے است آتش است اگر شمع
و موم است آتش است و اگر گزنده است آتش است گردانده است آتش
است هرچه که هست آتش است. باوصف تعداد اشیاء سوائے وحدت
هیچ نیست و هر مرتبه ازیں امور از دیگرے امتیاز کلی دارد مگر وحدت در ایں مراتب
باں روش تنزل نموده است که مورث تخیل کثرت و تعدد باشد و از تنزل
معنی حلول و اتحاد و اتصال که متبادر فهم بعض نافهماں است ازاں اصلاً گرد
نه گردیده است چه حلول و اتحاد و اتصال مقتضی خویشتن جسمین باشد و از جسم گردیدن
ماده فاسده ایں قسم توهمات اولاً فراغت یافتیم که قائل بوحدت شدیم بلکه
همان وحدت است که از شانے بشانے تنزل نموده است و در خارج موهم کثرت
گشته که اقتضاء ایں مرتبه همیں است چنانکه نزد منجمین در فن هیئت مقرر است
که چوں آفتاب در هر برجے از دوازده بروج می گذرد شکلے پیدا می کند مانند
اسد یا حوت یا سرطان یا دلو وغیره علی هذا القیاس در هر برج و لهذا آں مقام
بایں اسماء منقسم شدند همان عکس و ظل آفتاب است که به نسبت اقتضاء ایں
مقام ایں اشکال متخیل شدند و در اصل هیچ نیست سوائے آفتاب واحد همان آفتاب
است که هر یک اشکال دریں منازل ظهور کرده چنانکه اقتضاء مرتبه صرافت وحدت

مطلق است کہ در اصل مرتبہ خود منافی این وہم است. اگر شرح آفتاب این مقام وحدت عزمیت اشراق کند صفحہ آسمان کثرت موہومہ چون برف گداز و الله باقی من کل فان.

الہام حادی عشر

الہام حادی عشر. پس اگر کسی ببیند کہ عدد عشرہ دہ آحاد اند باین لحاظ درست است و اگر کسی ازین کثرت قطع نظر کند گوید کہ ہمان واحد است ہمان وحدت است. باین لحاظ این ہم صحیح است. علی ہذا القیاس ہر مرتبہ از مراتب اعداد ممکنہ ہمین حکم دارد کہ آنرا از وحدت چارہ نباشد و در اصل وحدت از تراحم این کثرت موہومہ اعتباریہ در ہر مراتب. مرتبہ از اعداد ممکنہ مفارقہ و غیرہ از امور مجردہ چہ از قسم روحانیات و چہ از قسم نورانیات و چہ از قسم حرکات و سکنات اجزاء رحانیات ہیچ نقصانے عائد نمی شود تا کہ در منتش عصمت ما منتش را تلوثے ہم رسد و ہم چنان وحدت در معدودات است کہ وابستہ اند بمادات، چہ از قسم عنصریات و چہ از قسم فلکیات. ھلم جرا من دونہا الی نہا. و من این الی این و من وضع الی وضع و من طور الی طور مثلاً از عشرہ تا مئات و از مآت تا آلاف. و از آلاف تا الوف تا آخر عدد پس بعد تنزل و ترکیب اعداد متکثرہ موہومہ فیما بین کہ بظاہر صورت عروج پیدا کردہ در رسد ناچار بحکم ما عندکم ینفد و ما عند الله باق و طوی الملک الیوم لله الواحد القہار. صورت نفاد یابد و در راہ فنا پیمودہ معدوم شود کہ قل لو کان البحر مدادًا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی و لو جئنا بمثلہ مددًا. بتبانیت مدلل حاکی است بآن چہ متناہی را با غیر متناہی ہمسری

کردن چه یارا است، پس همان وحدت نازله در مراتب ممکنه که وجود آنها عین معدوم و موهوم بود. و صورت حباب پیدا کرده رو به هستی نموده بود. بحکم آنکه وجود میانه ما بین العدمین باشد، بمنزله عدم باشد، چنانکه طهر در میان دو حیض حکم حیض دارد، بعد تحلیل اجزاء عادیه ممکنه موهومه که عکس همان وحدت است وجود خارج به بساطت در بساطت آن کما کان موجود است که هیچ تلویث و نقصی و خفتی و شرارتی و عیبی بباعث آن گوه کثرت و انبوه پیدا نکرده چنانکه بود بود و آن کثرت اعتباری منتهی که از شیونات آن وحدت عبارت است که نابود بود و به خارج و نموده بود نیست و نابود شد. فقیر گوید ؎

آپ سے آپ کو جانا تو نے جاناں تھے تم ؎ جان دی تجھ پہ غضب ہے کہ نہ مانا تو نے

ہر زماں شان نئی دیکھتے ہیں تیری ہم ؎ ہے نئی لیک کیا ہم کو پرانا تو نے

جوشش عشق میں بلبل سے گوائے شہ گل ؎ اور سکھلا دیا بلبل کو ترانا تو نے

پس دریں جا که مکان لامکان است و از منزله اقدام است و تحیره اذهان سختی وحدت دیگر چه باشد. چه قول به حلول و به اتحاد و عارض و معروض و تابع و متبوع و متمکن و مکان و زمان و احیان و کم و کیف و موضوع و محمول و اشتقاق و معادلات و تثنیت و ملیت و تقیید و اطلاق و عموم و خصوص و ایجاب و سلب و دخول و خروج و ملازمت و شروط و مشطور و کلی و جزئی و اسناد و افراد و ترکیب و وضع و اهمال و تلفظ و اعلام و قصر و ایجاز و اطناب و اسهاب و استصحاب و عکس و قلب و انشاء و خبر و حد و اوسط و نوع و جنس و فصل و تحلیل و تعاکس و تعدیل و امثال و ذلک که این جمله از معقولات ثانویه است و در این جا از اول تیغ وحدت

از لیہ گردن دوئی و مغائرت بریدہ است کہ دریں مرتبہ صورت مرتبہ اثنینیت و غیریت در خواب چہ بل در تخیل عکسے نینداختہ چہ دریں جا صورت صورت ازیں نقش سادہ است مگر در مراتب متنازلہ ایں چنیں امورات از قسم معقولات ثانیہ ہمآں روشن البتہ معقول می شوند کہ بساطت وحدت و صرافت او بلا تلوث ازیں مراتب ممکنہ و بلا استشمام اکتساب ایں مراتب قدم وحدت و توحد وحدت فی حد ذاتہ لذاتہ ملحوظ ماند ورنہ از لوث زندقیت ملوث باشد نعوذ باللہ منہا و ایں چنیں ظہور وحدت را در خارج از خزانہ مکمون غیب کہ اشارت است بہ کنت کنزاً مخفیاً عالم و ماسوی اللہ و غیر اللہ نامیدہ اند، چہ ایں چنیں مراتب عین مرتبہ واحد نباشند بلکہ بشلئے دیگر ملحوظ اند فقط۔

الہام ثانی عشر۔ و از ہمیں جا است، منشاء تخالف ظاہری فرقہ عینیہ و فرقہ ورائیہ کہ سابقاً تصریح اوشاں کردہ آمدہ ایم۔ پس فرقۂ عینیہ کہ رئیس اوشاں یعنی حضرت شیخ محی الدین بن عربی قدس اللہ سرہٗ العزیز اند۔ ازیں چنیں کثرت اعتباری و شیون متعددہ متنوعہ قطع نظر فرمودہ اند۔ وجود و ظہور آں را وہمی قرار دادہ اند نہ کہ حقیقی۔ پس ناچار بے اختیار قائل شدند کہ ہمہ اوست یعنی اگرچہ در توہم ہمہ اند مگر در حقیقت اوست و بر ظاہر است کہ روبروئے وجود حقیقی وجود وہمی را اعتبارے چہ باشد کہ ہمسنگ او شود و بایں اعتبار ایں سخن بیجا نیست بلکہ عین حق است کہ ہو الاول و الآخر و الظاہر و الباطن، و اینما تولوا فثم وجہ اللہ و از انہ لیات بلا موجہ است و برائے دفع شبہ محجوبین کہ می گویند اگر عالم وہمی الوجود است چرا از قوت عقل مانیست و نابود نمی شود در بایں تحقیق فرمودند کہ در دفع ایں[1]

[1] در دفع ایں توہم قوت عقل کارگر نباشد چوں تحقیق محال است فقیر بشرح و بسط میگوید

وہم بغیر ازالۂ دوئی کہ در بحر وحدت عین گرداب است و ورطۂ ہلاک بالیقین محال و
دوئی بغیر تخریق حجب و تصفیہ تکدرات محال و تخریق حجب ظلمانیہ بغیر اشراقیہ آفتاب
وحدت بر روزنۂ جان محال و انفتاح روزنۂ جان بغیر تربیت و تنویر نور جانِ
جاں و تنویر آں محال و نور جان جاں از عالم قدس است کہ محض برائے تخریق
حجب است و آں مرتبہ دومی است از مراتب نازلہ کہ مرتبہ اثنیت حقیقی است
و مرتبہ واحدیت اضافی کہ واسطہ است در میان واحد حقیقی و در میان سائر اعداد
ممکنہ و معدودات ممکنہ چوں فی الحقیقت از قسم اعداد ممکنات است۔ لہذا
واحد حقیقی شدن نمی تواند و در چوں در سلسلہ اعداد معدود است رتبہ اولیت
پیدا کردہ است و بمنزلہ واسطہ فیمابین واحد حقیقی و سائر اعداد نازل است۔
لہذا ثانی حقیقی است و حقیقت ایں عدد با عتبار دیگر مراتب عددیہ است
کہ جملہ متوہم الوجود اند و حقیقت متوہم الوجود از حقیقت و ہمیت نماید چہ خواہد کرد
شد پس حقیقت ایں عدد نیز وہمیہ است۔ پس اصلا اشتباہ نباید کرد کہ حقیقت
ثانی ناقص وحدت وجود واحد حقیقی شد و آں واسطہ بمنزلہ عنیک است پیش
واحد حقیقی برائے ملاحظۂ جمال خود در سائر اعداد ممکنات کہ بذریعہ آں نور قدس الواحد
حقیقی برائے ملاحظۂ جمال خود در سائر اعداد ممکنات کہ بذریعہ آں نور قدس۔ الواحد
حقیقی بر ہر کہ و مہ جلوہ می فرماید و ہر یکے را در قبض رسانی از انوار عنایت ارزانی
میدارد۔ پس کسانیکہ فی الحقیقت بواسطہ آں عنیک می توانند دید و کسانیکہ نابینا
مادرزاد اند و یا بسبب بعض عوارض عینیہ استعداد و قابلیت استبصار بآں نور
نمی دارند چگونہ توانند دید بعض ازیں قسم آنانند کہ

بعد از معالجہ توانند دید و بعضے ازیں استعداد بے بہرہ ازلی شدہ اند۔ نعوذ باللہ منہا۔ دیدن اوشان و انخراق حجب اوشان از نظر خیلی متعذر بلکہ محال کہ کریمہ انک لا تهدی من احببت الخ ذالک هدى الله يهدى به من يشاء الخ و خبر سرور کائنات سید المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم من اصاب من ذالک النور اهتدى ومن ضل اخطاء بیانی است شافی ازاں کہ آں واسطہ را عین اعیان ثابتہ نامند کہ افضل و اکمل اوشان است و آں عبارت است از ذات بابرکات خلاصہ کائنات سرور انبیاء والمرسلین محبوب رب العالمین محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ و آلہ کہ سائر انبیاء و رسل خوشہ چیں آں ثمرہ دوجہ باغ محبوبیت اند و چوں ایں نقطۂ اثنینیت احمد و احد حائلہ فیما بین از نظر عارف برخیزد۔ لا کلام در حق او ایں چنیں کلام کہ بیت فقیر است ع

خواہ احمد گوئی خواہ گوئی احد ✤ نیست فیما بین غیر ایں نقطہ حد

مباح باشد چہ در احمد ہماں وحدت بسیط است۔

مگر دریں جا در مرتبہ ممکن متنزل است و در احد در مرتبہ اصلیت خود در مرتبہ واجب است و در مرتبہ واجب و ممکن فرق است۔ ہمہ فرق کہ العبد عبد وان ترقی والرب رب وان تنزل یعنی چوں حجاب ہا از نظر عارف برخیزند و بمرتبہ قصویٰ معارف برسد آنگاہ در کثرت وحدت می بیند۔ الا بفرق مراتب یعنے در واجب واجب و در ممکن ممکن و در جوہر جوہر و در عرض عرض مصرع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

ہمیں حقیقت است مسئلہ وحدت وجود کہ برحق است۔ فلا خام طبعاں و نارسایاں

بسبب عمومیت این جمله منکر می شوند و معتقدان این مسئله را که از قضایاء مسلمهٔ بدیهیه است امّا بعد رفع حجب بشرط استعداد و نور مذکور تکفیر و تضلیل می کنند. و آن بزرگواران از وشان اغماض می فرمایند. چه الثنایان نا بالغ اند و از نا بالغان عاقلان بر حرکات الثنایان نا بالغ اند. و از نا بالغان عاقلان بر حرکات الثنایان گرانی نمی فرمایند و عین صواب است مصرع

چه قلندر هر چه گوید دیده گوید

مصرع :. هیچ آداب و ترتیبے مجو

فاما غیر عارف را همین حکم قائل است چنانکه در حق عارف عین نوشتن روا است پیش نا اهلان و محجوبان این قسم تقریر بمشابه آنکه پیش نا بالغان خوانده ان اشعار مشتمله بر اسرار عشق مجازی باشد. مصرع ذوق این می نشناسی بخدا تا نچشی فقط.

الهام ثالث عشر. و امّا فرقهٔ وراثیه که سالار قافلهٔ شان حضرت مجدد الف ثانی قدس سرهٔ اند. بعینیت وحدت با این چنین کثرت قائل نشده اند بلکه نسبت ظلّی و عکسی پیدا کرده اند و وجود خارج را وهمی نه فرموده اند بلکه تحقیقی، چنانکه شایان امکان باشد نه شایان وجوب لهذا نا چار بهمه از وست قائل شدند.

الهام رابع عشر. محاکمه فیما بین آنکه یکے را با دیگرے در اصل مقصود یعنی وحدت وجود و وجود کثیره هیچ مخالفت نیست که مخالفت کلی است تا مخالفت اصلی لازم آید و میدان تطبیق با وجود فراخی تنگی نماید بلکه مخالفت در فرع است، یعنی در کیفیت کثرت که آیا موهومه است یا متحققه بطرز تحقیق تبعیت یا متبوع و این قسم مخالفت در مقصود اصلی مخل شدن نمی توانند پس آنان که نظر بمآل کردند

قائل بکثرت موہومہ شدند و توہم سوائے در مرآۃ قوت متوہمہ روئے نہ نمودہ و حال متوہمہ ظاہر است کہ از وجود نا استشمام نیافتہ ناچار قائل ہمہ اوست شدند و آنانکہ نظر بہ تلبیس حال کردند، قائل بہ تحقیق آں کثرت شدند، بہ روش قیام ظل بذی ظل چنانکہ در تابع با متبوع خود انتساب است و چوں ظل را در خارج مستقل نیافتند بسبب تحقیق ایں یافت گو مرتبہ ظلی است، و ایں تحقیق البتہ وجودے غیر وجود ذی ظل کہ وجود مستقل است ہیدارد قائل ہمہ از وست شدند و ایں قسم مخالفت در مقصود اصلی ترکو رشدن نمی تواند بلکہ ایں تخالف مشابہ آں تخالف است کہ فیما بین ائمہ مجتہدین مثل حنفیہ و شافعیہ و مالکیہ و حنابلہ واقع است کہ در حق ایں قسم تخالف لفظ رحمت از زبان شارع صلعم صادر است کہ اختلاف امتی رحمت، یعنی ایں اختلاف در فروع عین رحمت است کہ ہر یکے بشرط اخلاص ماجور است نعوذ باللہ منہا چہ جائیکہ ایں اختلاف باعث ضلالت باشد کہ یکے بر دیگرے حکم تکفیر و تضلیل نماید، و اقدام بر ایں معنی خالی از نافہمی و تعصب نباشد و منشا ایں چنیں اختلاف فرعی از اختلاف کیفیات است نہ کہ اختلاف ذات چنانکہ صاحب ذوق افیون را باوجود حصول سکر کہ مقصود جملہ نشہ خواران است ادب از دست نمیرود کہ مقتضائے کیفیت ایں سکر غیر ایں نباشد کہ مولانا روم فرماید ؎

از ادب معصوم و پاک آمد ملک ⁂ وز ادب پر نور گشتہ است ایں فلک

و صاحب ذوق خمریات بندہیچ سررشتہ و آداب و پاس نمی باشد نہ کہ مقتضائے ایں سکر ہمیں است و سوائے ایں نباشد کہ مولانا روم قدس سرہٗ می فرماید ؎

چوں تو مستم کردۂ حدم مزن ⁂ شرع مستاں را بیارد حد مزن

پس بسبب این اختلاف کیفیت اصل مقصود که سکر است تحمل نمی شود و چون ایشان را
این حجاب را در پیش نداشتند خود را بوراثیه نام نهادند و او شان چون بسبب
بے خودی نشه خود حجاب برداشتند خود را لیقینیه مسمی کردند که مولانا روم فرماید

چونکه بیرنگی اسیر رنگ شد ٭ موسی با موسی در جنگ شد
چون به بیرنگی رسی کان داشتی ٭ موسی و فرعون دارند آشتی

در نظر ناتوان بینا انکار مسئله وحدت الوجود به نسبت حضرت مجدد قدس سره منجر می گردد خلاف واقع است که ازین تدقیق محاکمه هویدا شد پس حال این هر دو گروه فریقین این چنین داند که بمنزله اسدین اند و محجوبان بمنزله شغالان در دو بیشه .... ساتر تنحیر ان اند فیما بین هرگز هرگز نیفتند مبادا از صدمه ناخن سے ہستی نور دل شان به بیهیئت نیستی متبدل شود

رموز عاشقان عاشق بداند ٭ چه او داند که اشتر می چراند

مگر حق آنست که ملتزم مذهب عینیه را هیچ دقتی و اشکالی رو نماید و ملتزم مذهب وراثیه را البته خلجانی باقی ماند صرف در تعبیر است که در سیاق الضمیر چه ظاهر این هر دو فرقه بنسبت احوال وارده و باطن ایشان در حقیقت مجمع النور و واحد است چنانکه حجاج را راه ها سے مختلف در پیش می آید و در محل مقصود یعنی مکه معظمه و بیت الله متحد باشند پس ظاهر ایشان چشم بجاره به باطن ایشان دل در بند فقیر می گوید

تاب عینک کو ہے کیا دیکھے حقائق کے تئیں ٭ مجمع النور تو واحد ہے نہ جانا تو نے

پس هر سلسله و هر کمینه که صاحب ذوق بودن امری است دیگر از مذاق صاحب ذوق هم مذاق ندارد و از فریقین زبان طعن و تشنیع دراز می کنند آن احمال است که واحد را

دومی بیند، و بازمدّعی وحدت است کہ لا نفرق بین احد من رسلہ حجتی است بر آں با برہان قاطع و مراتب بزرگواران را البتہ رتبۂ علماء ورثۂ انبیاء مستحق است، پس بلا تامل سخن کردن بجز بادپیمودن دیگر نیست. اقول ہذہ الاسرار لا ینکشف علی المتعصبین و الاغیار چنانکہ ایں معنی مولانا روم صاحب مثنوی معنوی میفرماید

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است و تیز ؛ گر نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا ؛ کز بریدن تیغ را نبود حیا
زیں سبب من تیغ را کردم غلاف ؛ تا کہ کژ خوانی نخواند بر خلاف

واللہ اعلم و احکم

الہام خامس عشر۔ و بہم ترین قیاس تمثیل شجرہ و تخم آن در وحدت صرفہ و تکثر آں و استکمال آں از ابتدا بہر رگ و ریشہ و برگ و ثمر وغیرہ از امور منتشرہ خارجیہ ربلیہ باید تصور بدو توضیحش آنکہ چوں ایں تخم بہ اظہار صفت کمالات اصلیہ خود کہ در خود از خود از قدیم می داند و ایں دانستن عین اوست ایں چنیں دانستن او خویشتن را از وے منفک شدن جانب امکان تطرق نیافتہ کہ خارج از مقدور اوست، بغیر احتیاج و بلا استکمال کمال ثبوتے غیر بلکہ محض برائے اظہار تماشا و فیض رسانی است و تخم آں کمالات خانہ علم اوست کہ عین اوست توجہ نمود بالضرور از شان وحدت و صرافت بسیط خود شانے دیگر کہ عبارت است از نہانی کہ معدوم بود بر سطح امکان کہ مسبوق و مغلوب ہماں عدم صورتے بر روے کار آورد و ایں ہر دو نقیضین نیز یعنی عدم و امکان از قدیم در خانہ علم آں تخم بمرتبہ معلومیت ثبوتی می داشتند پس ہماں تخمے است کہ از وحدت خود روے بکثرت آورد علی ہذا القیاس، الحکم کل یوم ہو فی شان ہماں تخم

سر باوج کثیره درکشید و سطبری و قوتے گرفت شاخہائے دیگر مغائر شان اول پیدا
کرده هم چناں بعد آن شان انشقاق اغصان دیگر و شاخہائے خورد و کلاں و بعد
آں شان تلبس برگ و ثمار وغیره و بعد تختگی آن ثمار تا حالت لائق اقتنا و شئون
متغائره نیرنگی و بو قلمونی و تلمعہ گوناگونی و رنگ آمیزی و کارسازی با چندی و چونی
ظهور نمود بازہ بعد طے این مراتب شئون متعدده همان تخمی است که موجود بود این
مراتب شئون متعدده متغائره بہ ہیچ وجہ علیٰحده فضلاً عن العاقل ہیچ نابالغے عین
آں تخم که در مرتبه صرافت خود بود نخواہد گفت بلکه خواہد گفت این همان تخم و نوات
است که چہار رنگار رنگ دقائق مندمج خود را به شئون متکثره تماثره تلبس و تبرقع
نموده تماشا خود می بیند ہر که این جمله شئون و مراتب شئ واحد است آن را شئے
جامع می تواند شد چه تکثر اعتباری و وہمی و انقلاب شانی گو ولو فرضنا وجودی
دارد خواه وہمی خواه تحقیقی لطریق فلل علی سبیل المذہبین مزاحم وحدت حقیقی نمی
باشد چه اگر کسے مثلاً ہمیں شجر را از دور ببیند یا از متصل بشرط به نظر امعان و در
آن شرط تابع شدن حواس ظاهری متبوعات خود را که حواس باطنی اند و محکوم
تدبیر نفس ناطقه اند البته سعائے وجود و اخاد بسیط آں شجر که تخم است و دیگر از شاخ
ثمرنه خواهد دید اگر ثمر است آن وقت همان تخم است و اگر برگ است همان تخم
است و اگر شاخ است همان تخم است اگر تخم است همان تخم است و حاشا از
آنکه این مراتب شئون اعتبار به عین مرتبه تخم باشد یعنی نباشد ہر که این چنین مراتب
را ملحوظ نه دارد البته زندیق است نعوذ بالله منها و من الذی بہ القیاس چون این مقدمه ذہن نشین
شد به تصویر بحر و موج آن و کل و ظروف آں و سائر امثال پے باید برد ہر چند

بحر جان ناتوان به ایضاح هر امثله جوشش می زند فاما موجب فضولی است و ذیل این مختصر نیز طاقت تحمل آن ندارد و موجب ملالت و کسالت طالبین است لهذا بحکم آنکه ع چو پیش آید نشاید گذشتن به پیل به بند آب پیمه ختم کنیم۔

الهام سادس عشر

الهام سادس عشر و ظهور شان، نهان شدن آن نواة و مانند آن را از امثله منقحه و دیگر متفرعه برین قاعده بمنزله اعیان ثابته باید تصور بود و از همین جا است منشأ قائلین لهذا القول لا یصدر عن الواحد الا الواحد یعنی کسانیکه قائل اند که از واحد سوائے صدور واحد دیگر ممکن نباشد۔

الهام سابع عشر

الهام سابع عشر توضیحش آنکه یعنی در سلسله انقلاب شیون بدیهی است که از شان واحد بشان دیگر سوائے شان واحد انقلاب متصور نباشد چه شان عبارت است از ظهور حالت بسیط واحده لاجزء لها و ظهور دو شان در آن واحد از محالات است اگرچه آن شان لو فرضنا افراد عدیده کثیره دارد تا نیز بدین لحاظ از وحدت و بساطت خود پائے بیرون کشیدن نمی تواند چه اجتماع افراد شی واحد فی حالة واحدة ممتنع نباشد زیرا که افراد متمائز الشخصیة و النوعیة آن قدر تکثر و تعدد پیدا نه کرده اند که بالکل مغائر باشند و چون فردے از افراد متمائز الحقائق مداخل خواهد شد البته حکم متبدل خواهد شد چه تعدد و تکثر حقیقی رو خواهد نمود آن وقت البته انقلاب شانے به شانے دیگر بالضرور خواهد بود اگرچه حق آنست که حاجت بذکر این واهمه مستحیله نبود چه فرض المحال محال الّا تا نیز دفعاً لتوهم المتوهمین این خدشه را صاف کردیم مثلاً تخم در شان نهال در آمد بالضرور در همان وقت در شان تنه کامل به سطبری و درازی و بالائے نخواهد بود

چه شان امرے است آلہی نہ استقراری و در امر آلہی تعدد و تکثر ممکن نباشد
چوں تعدد و تکثر خواست که روئے نماید ہمیں امر بشان دیگر و متغایر گوئیم بحکم لا
یصدر عن الواحد الا واحد که کل یوم هو فی شان تجلی است بر آں جمیل ایں
مقدمه نازک تر و از مزلة الاقدام است قدم نهادن درین مقام گران تر است
و اکبر سوانح حلول ایام تسلیه است که روز اختتام ایں الهامات غیبیه بیست و پنجم
ذیقعده ۱۲۶۳ھ ہجری ہزار و دو صد و شصت و سه ہجری علی صاحبها افضل
التحیات و اکمل التسلیمات است. و ابتداء تحریر ایں تسوید تاریخ ہفت دہم ماه
مذکور سنه مصدر البیان است و تاریخ اختتام تبییض ایں ها پنجم ماه ذی الحجه سنه
مصدر و ابتدا تبییض بیست و ششم ماه ذیقعده سنه مذکور. پس بهذا المبلغ
فقیر تحریر تحقیق ایں مسئله به رساله مستقله منحصر داشت. ان شاء الله بعد لحوق با اوطان
بتنقیه ظهور خواهد آمد. الحمد لله اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً
اللهم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل
باطلاً و ارزقنا اجتنابه.

تمت

— × —

کتابیات

— x —

۱۔ ارشاد محمدی (مولانا شیخ محمد تھانوی) (۲) ارواح ثلثہ

۳۔ انوار محمدی (مولانا شیخ محمد تھانوی) (۴) بیاض حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی

۵۔ تذکرۃ الرشید (مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)

۶۔ ترجمہ شرح حزب البحر (مولانا فتح محمد تھانوی) (قلمی)

۷۔ رسالہ عطاء المنان (مولانا احمد اللہ مظفر نگری) (۸) رود کوثر (شیخ محمد اکرام)

۹۔ سرکشی ضلع بجنور (سر سید احمد خاں) (۱۰) ۱۸۵۷ء کے مجاہد (مولانا غلام رسول مہر)

۱۱۔ سوانح قاسمی (مولانا مناظر احسن گیلانی)

۱۲۔ سوانح مولانا محمد قاسم (مولانا محمد یعقوب نانوتوی)

۱۳۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی زندگی (مولانا عبید اللہ سندھی)

۱۴۔ علماء کا شاندار ماضی (مولانا محمد میاں۔ ناظم جمعیۃ العلمائے ہند)

(۱۵) فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

۱۶۔ لائل محمڈنس (سر سید احمد خاں) (۱۷) مآثر صدیقی موسوم بہ سیرۃ والاجاہی (نواب صدیق حسن خاں)

۱۸۔ ماہنامہ تذکرہ دیوبند (اپریل ۱۹۶۲ء) (۱۹) مثنوی معنوی دفتر ہفتم (مولانا شیخ محمد تھانوی)

۲۰۔ مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید (ڈاکٹر برہان احمد) (۲۱) نزہۃ الخواطر (مولانا عبد الحئی)

۲۲۔ نور محمدی (مولانا نسیم احمد علوی جھنجھانوی) (۲۳) SOME ACCOUNT OF THE ADMINISTRATION OF INDIAN DISTRICTS DURING THE REVOLT OF BENGAL ARMY. — By Henry George Keene

پاک اکیڈمی کی دیگر مطبوعات

مولانا فیض احمد بدایونی | مئولفہ محمد ایوب قادری ایم اے

جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء پر ایک معلومات افریں کتاب ہے جس میں جانباز حریت مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات نہایت تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں - قیمت صرف پچھتر پیسے

حقوق الاسلام | مئولفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (اردو ترجمہ وحیدالدین سلیم پانی پتی) قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے شاگرد اور حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے خلیفہ اور اپنے زمانے کے نامور مفسر، محدث اور فقیہہ تھے انہوں نے حقوق اللہ اور حقوق العباد پر ایک جامع اور مستند رسالہ فارسی میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ ادیب شہیر وحیدالدین سلیم پانی پتی نے کیا ہے اخر میں قاضی صاحب کا رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل ہے مجلد معہ گردپوش قیمت صرف دو روپئے -

مخزن الولایت | مئولفہ شاہ عزیز اللہ صفی پوری (اردو ترجمہ مولوی خصلت حسین بی اے علیگ) حضرت خادم صفی محمدی صفی پوری - تیرھویں صدی ہجری کے چشتیہ سلسلہ کے نامور بزرگ گزرے ہیں ان کے ذریعہ اودھ کو چشتیہ سلسلہ کو خوب ترقی ہوئی یہ کتاب حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اس میں تصوف پر جامع اور مستند معلومات شامل ہیں -
(زیر طبع)

****

پاک اکیڈمی ۱۴۱/۱ وحیدآباد، کراچی نمبر ۱۸